اسلامیات (لازمی)

گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے لیے

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو سندھ

رَبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا
(اے میرے رب! میرا علم زیادہ کر)

اسلامیات (لازمی)

گیارہویں اور بارہویں جماعت کے لیے

023

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو
ناشر
الحفیظ پرنٹنگ پریس کراچی

جملہ حقوق بحقِ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو محفوظ ہیں۔

تیار کردہ : وفاقی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان، اسلام آباد،
نوٹیفکیشن نمبر۔ الف۔ ۱۱۔ ۱۶۔ ۸۱ ایچ ایس ٹی
منظور شدہ بطور واحد نصابی کتاب برائے محکمۂ تعلیم، صوبہ سندھ

مُصَنِّفِین

پروفیسر حسن الدین ہاشمی
مولانا تلمیذ الحسنین رضوی
پروفیسر محبوب الرحمٰن
پروفیسر عنایت علی خاں
شیخ سعید اختر
مولانا عبدالرشید نعمانی

نظرِ ثانی

پروفیسر محمد قاسم مظہر
پروفیسر سمیع اللّٰہ قریشی
پروفیسر افتخار بھٹہ
پروفیسر شمس الہادی
پروفیسر فضل حق میر
پروفیسر عارف نسیم
پروفیسر محمد سراج
محمد ناظم علی خان ماتلوی

نگراں : عبدالحکیم پٹھان

مطبوعہ : الحفیظ پرنٹنگ پریس کراچی

فہرست

باب	عنوانات	صفحہ نمبر
	اسلام کا تعارف	۵
باب اوّل ــــ	بنیادی عقائد	۷
	۱۔ اللہ پر ایمان (توحید)	۷
	۲۔ رسالت	۱۹
	انبیاء کی خصوصیات	۲۳
	رسالت محدی صلی اللہ علیہ وسلّم اور اس کی خصوصیات	۲۴
	۳۔ ملائکہ پر ایمان	۲۸
	۴۔ آسمانی کتابیں	۳۱
	۵۔ آخرت	۳۵
باب دوم ــــ	اسلامی تشخص	۴۱
	ارکانِ اسلام	۴۱
	کلمۂ شہادت	۴۱
	نماز	۴۳
	روزہ	۴۷
	زکوٰۃ	۵۱
	حج	۵۶

جہاد ۶۰
اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت واطاعت ۶۴
حقوق العباد ۶۶
معاشرتی ذمے داریاں ۷۵
باب سوم ـــــ اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۹۱
رحمۃ للعالمین ۹۲
اخوت ۹۵
مساوات ۹۶
صبر واستقلال ۹۷
عفو ودرگذر ۹۹
ذکر ۱۰۱
باب چہارم ـــــ تعارفِ قرآن وحدیث ۱۰۳
تعارف قرآن مجید ۱۰۳
مکی اور مدنی سورتیں ۱۰۷
حفاظت وتدوین قرآن ۱۰۸
حدیث اور سنت ۱۱۷
حدیث یا سنت کی شرعی حیثیت ۱۱۸
تدوین حدیث ۱۲۱
منتخب آیات ۱۲۴
منتخب احادیث ۱۲۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلام کا تعارف

اسلام کے لفظی معنی ہیں حکم ماننا، کسی کے سامنے گردن جھکا دینا اور اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا۔ شریعت میں انبیائے کرام کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کے احکام ماننے، اس کے سامنے گردن جھکانے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینے کا نام اسلام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک خاص نظم و ضبط کا پابند پیدا کیا ہے۔ زمین ایک مقررہ وقت میں سورج کے گرد اپنا چکر پورا کرتی ہے۔ دن اور رات ایک خاص پابندی کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ سورج اور چاند مقررہ وقت پر طلوع و غروب ہوتے ہیں۔ موسم مقررہ انداز میں بدلتے رہتے ہیں اور کائنات کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی، کیوں کہ احکام الٰہی کی پابندی ان کی فطرت میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات سے ممتاز پیدا کیا ہے۔ اسے عقل و فکر کی نعمت دے کر ایک محدود دائرے میں اختیار بھی دیا ہے۔ اگرچہ اسے اپنی موت و حیات پر کوئی اختیار نہیں، لیکن اس عرصۂ حیات کے مختصر وقفے میں وہ جو کچھ کرتا ہے، اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے۔ "اسلام" چاہتا ہے کہ انسان اپنے فکر و عمل کو اللہ اور اس کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے احکام کا تابع کر دے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

ترجمہ: آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کیا۔

دین اسلام ایمان اور عمل صالح کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسالت اور آخرت وغیرہ کا زبان سے اقرار اور ان پر دل سے یقین ایمان کہلاتا ہے اور اسلام کی رو سے ایمان کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے کو عمل صالح کہتے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ عبادات:

عبادات اللہ کے حضور انتہائی عاجزی اور محتاجی کے اظہار کا نام ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج جیسے احکام کی بجا آوری کو عبادت کہتے ہیں۔

۲۔ معاملات:

ان کا تعلق معاشرتی حقوق و فرائض سے ہے۔

۳۔ اخلاق:

انسانی سیرت کی وہ خوبیاں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور انسان کی شخصیت کو نکھارتی ہیں۔

اعمال کی یہ تقسیم صرف سمجھنے کے لیے ہے۔ ورنہ دین کو حصّوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کے ٹکڑے کرکے ایک دوسرے سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ آدمی ایمان تو لائے لیکن احکامِ الٰہی پر عمل نہ کرے یا نیک کام تو کرے لیکن اللہ اور اس کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم پر ایمان نہ لائے۔ ایسا ایمان اور عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں۔ جو نیک کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نہ کیا جائے اس سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا اور اس سے دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص صرف عبادات میں مصروف رہے لیکن اس کے معاملات اُحکامِ الٰہی کے مطابق نہ ہوں تو اس کو ہم "باعمل مسلمان" نہیں کہہ سکتے۔ نہ کوئی بد اخلاق آدمی اچھا مسلمان کہلا سکتا ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے متعلق رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے قول و عمل سے اللہ تعالیٰ کے احکام ہم تک نہ پہنچائے ہوں۔ ان احکام کو ہر پہلو سے ماننا لازم ہے۔

باب اوّل

بنیادی عقائد

اعمال کی بنیاد ایمان پر ہے۔ ایمان اس پختہ عقیدے کو کہتے ہیں جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اور اس میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ ایسا عقیدہ روح میں رچ بس جاتا ہے اور دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی بات اس کے خلاف نہیں سوچی جا سکتی اور کوئی عمل اس عقیدے کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ تمام اعمال اس عقیدے کی وجہ سے اور اسی کے اشارے پر کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کو جب دینِ اسلام پھیلانے کا حکم ملا تو آپؐ نے عقائد کی اصلاح سے ابتدا فرمائی۔

اسلام کے بنیادی عقائد یہ ہیں:

۱۔ اللہ پر ایمان۔
۲۔ ملائکہ پر ایمان۔
۳۔ آسمانی کتابوں پر ایمان۔
۴۔ رسالت پر ایمان۔
۵۔ آخرت پر ایمان۔
۶۔ تقدیر پر ایمان۔
۷۔ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان۔

اللہ پر ایمان۔ (توحید)

بنیادی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ توحید کا ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔" اللہ

کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ توحید کے لغوی معنی ہیں ایک ماننا، یکتا جاننا۔ دین کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے، اس دنیا کے پیدا کرنے والے اور اس کے پروردگار کو ایک ماننا، بے مثال ماننا اور صرف اُسی کو عبادت کے لائق سمجھنا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفٰے (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم) تک جتنے بھی پیغمبرانِ کرام دنیا میں تشریف لائے ہیں، سب نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور انھیں بتایا کہ یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں۔ اور اسی کے حکم سے یہ سب کچھ ختم ہوگا۔ وہ ایک ہے، اس جیسا کوئی نہیں، صرف اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی کا حکم ماننا ضروری ہے۔

وجود باری تعالیٰ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے میں کوئی عاقل اور سمجھدار شک نہیں کر سکتا۔ عقل کا یہی تقاضا ہے۔ ہم کوئی بھی چیز جب دیکھتے ہیں تو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا بنانے والا بھی ہے۔ یہ جو مکان نظر آتا ہے کسی معمار کا بنایا ہوا ہے، یہ جو گھڑی چل رہی ہے، کسی کارخانے میں بنی ہے اور اس کارخانے کو کوئی چلا رہا ہے۔ کوئی مکان خود بخود نہیں بنتا۔ کوئی گھڑی خود بخود نہیں بنتی۔ کوئی کارخانہ خود بخود نہیں چلتا۔ پھر دنیا کا یہ عظیم الشان کارخانہ جو نامعلوم وقت سے اب تک ایک خاص نظام کے تحت چل رہا ہے، خود بخود کیسے پیدا ہو سکتا ہے اور کیسے چل سکتا ہے؟ زمین ایک خاص وقت میں سورج کے گرد اپنا چکر پورا کرتی ہے۔ آج تک اس میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں پڑا۔ ستارے اپنے وقت پر ابھر آتے ہیں اور اپنے وقت پر نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ اپنی رفتار نہیں بھولتے۔

قرآن مجید میں ہے:

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ، فَارْجِعِ
الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ہ

(سورۃ الملک ۳)

ترجمہ: تو (خدائے) رحمٰن کی صنعت میں کوئی فتور نہیں دیکھے گا۔ پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے۔ کیا کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے؟

سورج اپنے مدار میں چکر لگا رہا ہے اور چاند اپنے مدار میں۔ نہ سورج اپنے مدار سے ہٹتا ہے، نہ چاند سورج کی طرف کھنچ کر جاتا ہے۔ نہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رات آتے آتے رک جائے اور نہ کبھی یہ کہ دن جاتے جاتے رہ جائے۔ قرآنِ مجید نے اس کی حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ
سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝

(سورۂ یٰسٓ : ۴۰)

ترجمہ: نہ سورج کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے۔ اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔

قدرت کا یہ کارخانہ اسی نظم و ضبط کے ساتھ ایک نامعلوم مدت سے مسلسل چل رہا ہے۔ کیا عقل یہ مانتی ہے کہ اتنا بڑا انتظام اتنی مدت سے مسلسل بغیر کسی چلانے والے کے چل سکتا ہے؟ ظاہر ہے عقل یہ بات نہیں مان سکتی۔ اس لیے خود یہ کائنات دن رات، چاند سورج اور زمین و آسمان کا یہ نظم و ضبط اللہ کے وجود کا بیّن ثبوت ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ
وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

(سورۂ آلِ عمران : ۱۹۰)

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدلتے رہنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود اس کی اپنی پیدائش کی طرف متوجہ کیا ہے کہ سوچو اور اگر یہ بات سمجھ میں آجائے تو پھر اس پر یقین کر لو۔ شک و شبہ میں مت پڑو۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ

خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝

(سورۃ الطور: ۳۵-۳۶)

ترجمہ: کیا یہ لوگ (انسان) بغیر کسی کے (پیدا کیے) پیدا ہو گئے ہیں یا یہ کہ خود (اپنے) خالق ہیں۔ یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر لیا ہے اصل یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔

نظامِ کائنات کی یہ گواہی ایک عقلی دلیل ہے۔ اس دلیل کے بغیر بھی اللہ کو ماننا انسانی فطرت کی آواز ہے اور انسان کی روح کو ایک خالقِ کائنات کے ماننے اور اس کی عبادت کرنے کے بغیر سکون نہیں ملتا۔ اس لیے انسانیت کے ہر دور میں مہذب سے مہذب اور وحشی سے وحشی قوموں نے کسی نہ کسی صورت میں ایک عظیم ذات کا اعتراف کیا ہے اور اس کی عبادت کی ہے۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں بسنے والی وحشی اقوام جن کی فکری سطح بہت کم تھی وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی قائل تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ پر ایمان لانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ بڑے سے بڑا کافر بھی کسی بڑی مصیبت میں پھنس کر بے اختیار اپنے بنانے والے کو پکار اٹھتا ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ
تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ
مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ
كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝

(سورۂ انعام: ۶۳-۶۴)

ترجمہ: آپ کہیے وہ کون ہے جو تم کو نجات دے دیتا ہے خشکی اور تری کے اندھیروں سے، کہ تم اس کو پکارتے ہو آہ و زاری کرتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے۔ پھر دیکھیے اللہ ہی تم کو ان (مصیبتوں) سے نجات دیتا ہے اور ہر غم

ے، پھر بھی تم شرک کرنے لگتے ہو۔

یہ پکار انسان کی اصلی فطرت ہے اور یہ فطرت اللہ تعالیٰ کی موجودگی کی سب سے بڑی گواہ ہے۔

جس طرح یہ بات واضح اور یقینی ہے کہ اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا اور چلانے والا ہے اور وہ اللہ ہے، اسی طرح یہ بات بھی واضح اور یقینی ہے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ انسانی عقل خود اپنی سوچ میں اسی نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو ہر ایک اس دنیا کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق چلانے کی کوشش کرتا۔ ایک کشمکش شروع ہو جاتی اور اس کھینچا تانی میں دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا

(سورۂ انبیاء: ۲۲)

ترجمہ: اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے علاوہ اور معبود ہوتے تو ان دونوں (زمین و آسمان) میں فساد برپا ہو جاتا

توحید ذات و صفات اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور اس کارخانۂ قدرت کو چلانے والا موجود ہے اور ایک ہے۔ اس حد تک تو یہ بات واضح ہے اور انسانی عقل نے اس کو ہمیشہ مانا ہے۔ مگر وہ پیدا کرنے والا کیسا ہے؟ اس کے اوصاف کیا ہیں؟ یہ ایسی باتیں ہیں جو آسانی سے خود بخود سمجھ میں نہیں آتیں۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؑ بھیجے ہیں اور ان کے ذریعے اپنے بندوں کو اپنے متعلق بتایا ہے۔

قرآن مجید نے ذات باری تعالیٰ کے متعلق وہ تمام باتیں صاف صاف بتائی ہیں جن پر ایمان لانا فرض ہے۔ اللہ جو تمام کائنات کا پیدا کرنے والا ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ دنیا نہیں تھی تو اللہ تھا۔ یہ دنیا نہیں ہوگی تو بھی اللہ ہوگا۔ اس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ یہ دنیا اس نے پیدا کی ہے اور وہی اس کی نگہداشت کر رہا ہے۔ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور قیامت آجائے گی تب بھی وہ ہوگا اور انسانوں کو جزا و سزا دے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

(سورۃ القصص: ۸۸)

ترجمہ: ہر ایک چیز اس کی ذات کے سوا فنا ہونے والی ہے۔

وہ اللہ اپنی ذات میں ایک ہے۔ نہ اس کا کوئی باپ ہے جس سے وہ پیدا ہوا ہو نہ اس کے بچے ہیں جو اس سے پیدا ہوئے ہوں اور نہ اس جیسا کوئی اور ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (سورۃ الاخلاص)

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔

سوچا جائے تو یہ سب باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ جس نے دنیا کی ہر چیز پیدا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر چیز سے پہلے موجود تھا اور جب اس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے تو وہ ان کو جب چاہے فنا بھی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا کوئی باپ نہیں ہے ورنہ وہی خدا ہوتا۔ اس کے بچے بھی نہیں ہیں ورنہ وہ ضرور خدائی میں شریک ہوتے اور اس طرح ایک خدا کا تصور ختم ہو جاتا۔

اس بے مثال ذات نے اپنا ذاتی نام اللہ رکھا ہے۔ یہ نام کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اللہ کے بہت سے صفاتی نام ہیں جن سے ہمیں اللہ کو پکارنے کا حکم ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (سورۃ الاعراف: ۱۸۰)

ترجمہ: اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ سو ان ناموں سے اللہ ہی کو پکارا کرو۔

اس بے مثال اور یکتا ذات اور ان بے مثال اور یکتا صفات کے تقاضے بھی یکتا ہیں۔ جب وہ ہمارا مالک ہے اور اس جیسا مالک کوئی نہیں۔ وہ ہمارا پروردگار ہے اور اس جیسا پروردگار کوئی نہیں۔ تو پھر وہی عبادت کے لائق ہے۔ عبادت کے لائق اور کوئی نہیں۔ اور اسی کا حکم ماننا چاہیے کسی اور کو حکم دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اسی سے مدد مانگنی چاہیے۔ اور اسی سے ہدایت طلب کرنی چاہیے۔ اس لیے ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں قرآن مجید کی یہ سورت دہراتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ
مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۭ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۭ
اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ
وَلَا الضَّاۗلِّیْنَ ۧ (سورۃ الفاتحہ)

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ مالک ہے روزِ جزا کا۔ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ دکھا دے ہم کو سیدھا راستہ۔ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو گمراہ ہیں۔

شرک عقیدۂ توحید انسان کا سب سے پہلا عقیدہ ہے۔ شرک اور اس کی تمام اقسام بعد کی پیداوار ہیں۔ دنیا کا پہلا انسان عقیدۂ توحید ہی کا قائل تھا۔ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ جو اللہ تعالیٰ کے پہلے نبی تھے۔ آپ نے اپنی اولاد کو بھی اسی عقیدے کی تعلیم دی مگر جیسے جیسے انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور لوگ اِدھر اُدھر بکھرنے لگے تو آہستہ آہستہ لوگوں نے سچی تعلیمات کو بھلا دیا اور گمراہی کا شکار ہو کر

ایک اللہ کی بجائے کئی خدا ماننے لگے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انھیں بھی معبود بنا لیا۔ ان لوگوں نے جس چیز کو ہیبت ناک دیکھا اس سے ایسے خوفزدہ ہوئے کہ اسے دیوتا سمجھ لیا اور اس کی پوجا پاٹ شروع کر دی، اس طرح انھوں نے آگ کا دیوتا، سمندر کا دیوتا اور آندھیوں وغیرہ کے دیوتا گھڑ لیے۔ دوسری طرف جن چیزوں کو بہت نفع بخش پایا ان کی بھی پوجا شروع کر دی۔ گائے وغیرہ کی پوجا اسی وجہ سے شروع ہوئی۔ ان لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے کئی پیغمبر بھیجے۔ جنھوں نے ان کو توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور شرک کی مذمت کی۔ قرآن مجید میں شرک کو بہت بڑا ظلم کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝

(سورۂ لقمان: ۱۳)

ترجمہ: بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ
لِمَنْ يَّشَآءُ ج (سورۃ النساء: ۴۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ (یہ بات) معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ (اور گناہ) جس کسی کو بھی چاہے گا بخش دے گا۔

شرک کے لغوی معنی "حصہ داری" اور "ساجھے پن" کے ہیں۔ دین کی اصطلاح میں شرک کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، یا صفات، یا صفات کے تقاضوں میں کسی کو اس کا حصہ دار اور ساجھی ٹھہرایا جائے۔ اس طرح شرک کی تین اقسام ہیں۔

۱: **ذات میں شرک** اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت میں کسی دوسرے کو حصہ دار سمجھنا۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے میں یہی حقیقت مان کر اسے اللہ تعالیٰ کا ہمسر اور برابر سمجھنا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی اولاد سمجھنا یا کسی کو اللہ تعالیٰ کی اولاد سمجھنا، کیوں کہ والد اور اولاد کی حقیقت ایک

ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا جس طرح دو خداؤں یا تین خداؤں کو ماننا شرک ہے اسی طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا یا بیٹی سمجھنا بھی شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

(سورۂ اخلاص : ۳، ۴)

ترجمہ : نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔

۲ : صفات میں شرک اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جیسی صفات کسی دوسرے میں ماننا اور اُس جیسا علم، قدرت یا ارادہ کسی دوسرے کے لیے ثابت کرنا۔ کسی دوسرے کو ازلی و ابدی سمجھنا یا کسی دوسرے کو قادرِ مُطلق تصوّر کرنا، یہ سب، اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ (سورۂ شوریٰ : ۱۱)

ترجمہ : کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔

ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے، کیوں کہ جس میں جو صفت بھی پائی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ذاتی ہیں کسی کی عطا کردہ نہیں۔

۳ : صفات کے تقاضوں میں شرک اللہ تعالیٰ عظیم صفات کا مالک ہے ۔ ان صفات کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے، اور اُسی کے سامنے پیشانیاں جھکائی جائیں۔ حقیقی اطاعت و محبّت کا صرف اسی کو حق دار سمجھا جائے اور یہ ایمان رکھا جائے کہ وہی کارساز ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ صرف اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ اُسی کے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اور اس کے قوانین کے مقابلے میں کسی کا قانون کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا :

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (سورۃ الاسراء : ۲۳)

ترجمہ : تم صرف اسی کی عبادت کیا کرو۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

(سورۃ البقرۃ: ۱۶۳)

ترجمہ: اور تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ بجز اس کے کوئی معبود نہیں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝

(سورۃ المائدۃ: ۴۴)

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ تو کافر ہیں۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ (سورۂ یوسف: ۴۰)

ترجمہ: حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی کو منعمِ حقیقی سمجھا جائے اور خلوصِ دل سے اس کا شکر بجالایا جائے۔ یہ شکر صرف یہی نہیں کہ زبان سے "یا اللہ تیرا شکر ہے" کہہ دیا جائے بلکہ اس کی حقیقی صورت یہ ہے کہ اپنی اطاعت و بندگی کا رُخ صرف اللہ کی ذات کی طرف پھیر دیا جائے اور غیر اللہ کی اطاعت و بندگی کا اپنی عملی زندگی میں کوئی شائبہ تک نہ رہنے دیا جائے۔

ہمیں یہ خوب خیال رکھنا چاہیے کہ شرک صرف یہی نہیں کہ پتھر یا لکڑی کے بت بنا کر ان کو پوجا جائے بلکہ یہ بھی شرک ہے کہ ہر چھوٹی بڑی حاجت پوری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے لَو لگائی جائے۔

ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ ہی کو قادرِ مطلق اور مُسَبِّبُ الاَسباب سمجھ کر اسی کے فضل و کرم سے اپنی مجبوریوں کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ بے شمار مسلمان ایسے ملتے ہیں جو زبانی طور پر تو اللہ تعالیٰ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن عملاً اپنی اولاد، روزگار، صحت اور دیگر مسائل کو انسانوں کے سامنے اسی عاجزی اور امید سے پیش کرتے ہیں، جس طرح صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

انسان کی اس کمزوری کا بیان اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ۝

لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُونَ ۝

(سورۂ یٰس: ۷۴-۷۵)

ترجمہ: اور پکڑتے ہیں اللہ کے سوائے دوسرے کارساز۔ شاید ان کی طرف سے ان کو
مدد پہنچے۔ (حالانکہ) وہ ان کی مدد کی (کوئی) طاقت نہیں رکھتے اور یہ ان کی فوج
ہو کر پکڑے آئیں گے۔

آگے فرماتے ہیں:

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ

(سورۃ الملک: ۲۱)

ترجمہ: بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو۔ اگر اللہ روک لے اپنی روزی۔

انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کے اثرات توحید کا عقیدہ دل میں راسخ ہو جائے۔ شرک کے اندیشے ذہن سے نکل جائیں اور انسان کو کامل یقین ہو جائے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کے پاس طاقت ہے نہ قدرت ہے۔ نہ اس کے سوا کوئی کچھ دے سکتا ہے اور نہ اس کے دیے ہوئے کو کوئی روک سکتا ہے۔ نہ کسی اور کے ہاتھ میں نہ نفع ہے نہ نقصان۔ تو اس کی شخصیت کو بہت مستحکم بنیادیں مل جاتی ہیں۔ اس کے فکر اور عمل میں ہم آہنگی آجاتی ہے اور اس کی زندگی کے سارے پہلو سنور جاتے ہیں۔ اس کی نکھری ہوئی شخصیت کی کچھ نمایاں نشانیاں یہ ہوتی ہیں۔

۱۔ خودداری توحید پر یقین رکھنے والا خوددار اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ قدرت رکھنے والا صرف اللہ ہے۔ باقی سب میرے جیسے انسان ہیں۔ ضعیف، کمزور اور بے بس۔ اس لیے اس کا سر صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہے۔ وہ نہ اپنے جیسے انسانوں کے دروازوں پر حاضری دیتا ہے نہ انسانوں کی بنائی ہوئی بے جان مورتوں کو سجدہ کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک خدا کافی ہے۔

۲۔ انکسار عقیدۂ توحید سے تواضع و انکسار پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ توحید کا پرستار جانتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے بے بس ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے سب اسی کا دیا ہوا

ہے۔ جو اللہ تعالیٰ دینے پر قادر ہے وہ چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ لہٰذا بندے کے لیے تکبر و غرور کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسے تو تواضع و انکساری زیب دیتی ہے۔

۳۔ وسعتِ نظر عقیدۂ توحید کا قائل تنگ نظر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ اس رحمٰن و رحیم پر ایمان رکھتا ہے، جو کائنات کی ہر چیز کا خالق اور سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس کی رحمتوں سے سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس عقیدے کے نتیجے میں مؤمن کی ہمدردی، محبت اور خدمت عالمگیر ہو جاتی ہے اور ساری مخلوقِ الٰہی کی بہتری کو وہ نصب العین بنالیتا ہے۔

۴۔ استقامت و بہادری اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے استقامت اور بہادری پیدا ہوتی ہے۔ مؤمن جانتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کو سب قدرت حاصل ہے۔ لہٰذا اسی کے سامنے جھکنا چاہیے اور اسی سے ڈرنا چاہیے۔ اس عقیدے کے ذریعے مؤمن کے دل سے دوسروں کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ استقامت اور بہادری کی تصویر بن جاتا ہے اور کسی بڑے سے بڑے فرعون کا خوف اپنے دل میں نہیں لاتا۔ خواہ بدر و اُحد کی لڑائی ہو یا حُنَین و خندق کی۔ وہ ہر جگہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہوتے ہیں) کا پیکر بن جاتا ہے۔

۵۔ رجائیت اور اطمینانِ قلب عقیدۂ توحید کا ماننے والا مایوس اور نا امید نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت باری تعالیٰ کی رحمت پر آس لگائے رکھتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ وہ تمام خزانوں کا مالک ہے اور اس کا فضل و کرم بے حد و حساب ہے۔ انسان جس قدر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کے دل کو اتنا ہی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

۶۔ پرہیز گاری عقیدۂ توحید سے انسان کے دل میں پرہیز گاری پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہر مؤمن کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام ظاہر اور پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ اگر بندہ پوشیدگی میں کوئی جرم کرے تو ممکن ہے لوگوں کی نگاہوں سے چھپ جائے۔ مگر اپنے

اللہ کی نظر سے نہیں چھپ سکتا، کیوں کہ وہ تو دلوں کے ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ یہ ایمان انسان میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ خلوت و جلوت میں کہیں بھی گناہ کا ارتکاب نہ کرے اور ہمیشہ نیک اعمال بجالائے، کیوں کہ معاشرہ اسی وقت صحیح معنوں میں انسانی معاشرہ بن سکتا ہے جب لوگوں کے اعمال درست ہوں۔ توحید پر ایمان، عملِ صالح کی بنیاد فراہم کرتا ہے، کیوں کہ انسان کے تمام اعمال اس کے دل کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر دل میں ایمان کی روشنی موجود ہو تو عمل صالح ہوگا۔

نجات و فلاح کے لیے ایمان اور عملِ صالح دونوں کا ہونا ضروری ہے اسی لیے قرآن مجید میں جابجا ارشاد ہوا:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

ترجمہ: جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے۔

جس طرح کوئی درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح ایمان کی پہچان عملِ صالح سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، مگر اس کے اعمال اچھے نہیں تو یہی سمجھا جائے گا کہ ایمان نے اس کے دل کی گہرائیوں میں پوری طرح جگہ نہیں پکڑی۔ غرضیکہ عقیدۂ توحید اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نیک اعمال بجالائے جائیں اور برے اعمال سے بچا جائے۔

۷۔ تَوَكُّل عَلَى اللّٰه مومن دنیا کے اسباب کو ترک نہیں کرتا بلکہ ان سے پورا پورا استفادہ کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مؤثرِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کو جانتا ہے اور ہر حال میں اسی کی ذات پر بھروسہ کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا

(سورۂ یونس: ۸۴)

ترجمہ: اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو۔

رسالت

انسان کو ذاتِ باری کی صحیح پہچان اس کے رسولوں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

اس لیے اسلام کے سلسلۂ عقائد میں توحید کے بعد رسالت کا درجہ ہے۔ رسول کے لغوی معنی ہیں پیغام دے کر بھیجا ہوا یعنی پیغام پہنچانے والا۔ دین کی اصطلاح میں رسول وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب فرمایا ہو۔ رسول کو نبی بھی کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں خبر دینے والا۔ رسول کو ہم پیغمبر بھی کہتے ہیں۔ یعنی پیغام لانے والا۔

رسالت ملنے سے پہلے بھی رسول کی زندگی اپنی قوم میں بہترین زندگی ہوتی ہے وہ پاکباز، نرم خُو۔ نیک طِینت، سچا اور امانتدار ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام سناتے وقت کوئی اس کو بے اعتبار یا جھوٹا نہ کہہ سکے۔ اور وہ دعویٰ سے کہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ

(سورۂ یونس: ۱۶)

ترجمہ: میں نے اس سے پہلے تمھارے درمیان کافی زندگی گزاری ہے۔

وحی

رسالت کے لیے اگرچہ کوئی عمر مقرر نہیں لیکن اکثر رسولوں کو کافی پختہ عمر میں وحی کے ذریعے رسالت ملی ہے۔ وحی کے معنی ہیں دل میں چپکے سے کوئی بات ڈالنا، اشارہ کرنا یا کسی فرشتے کے ذریعے پیغام پہنچانا۔ دین کی اِصطِلاح میں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام ہے۔ جو اس نے اپنے کسی رسول پر فرشتے کے ذریعے نازل کیا ہو۔ یا براہ راست اس کے دل میں ڈال دیا ہو یا کسی پردے کے پیچھے سے اسے سنوا دیا ہو۔ قرآن مجید میں وحی کا لفظ ان تینوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ
وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ
مَا يَشَآءُ

(سورۂ شوریٰ: ۵۱)

ترجمہ: اور کسی بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے۔ یا وہ

کسی قاصد کو بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے
وحی کرتا ہے۔

اللہ تعالٰی نے دنیا کی مختلف اقوام کی طرف رسول بھیجے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (سورۃ النحل:۳۶)

ترجمہ: اور ہم نے ہر اُمّت میں رسول بھیجے۔

اللہ تعالٰی کی یہ دنیا بہت پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے اللہ کے تمام رسولوںؑ کی صحیح تعداد نہ جانے کتنی ہوگی۔ کچھ لوگوں نے یہ تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی ہے۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ہو یا کم ہو۔ ان میں سے صرف چند اَنبیاء کے نام قرآن مجید میں ذکر کیے گئے ہیں جن کے ناموں کے ساتھ عرب مانوس تھے۔ بہت سے انبیاء کے نام قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ جس طرح قرآن مجید میں ارشاد ہے:

مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (سورۃ المؤمن: ۷۸)

ترجمہ: (ان رسولوں) میں بعض کا حال ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

اس لیے ہر قوم کی اسلام سے پہلے کی برگزیدہ ہستیوں کا احترام کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی نبی ہو اور بعد میں اس کی تعلیمات لوگ بھول گئے ہوں۔

انبیاءؑ کا یہ سلسلہ حضرت محمد مصطفٰی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم پر ختم ہو گیا اور اب قیامت تک تمام انسانوں پر صرف آپؐ کی پیروی فرض ہے لیکن دین کی رُو سے تمام گزرے ہوئے انبیاء کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان میں کوئی فرق کرنا جائز نہیں قرآن مجید میں ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (سورۃ بقرہ: ۲۸۵)

ترجمہ: ہم اس کے رسولوں (پر ایمان لانے) میں کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

یہ سب اللہ کے رسول نیک، پاک اور سچے تھے۔ سب نے توحید کی تعلیم دی ہے اور سب کی نبوت پر ہمارا ایمان ہے۔ البتہ ان کی تعلیمات میں لوگوں نے ردّ و بدل کیا ہے لیکن ان کی صحیح تعلیم وہی ہے جو قرآن مجید نے بیان فرمائی ہے۔

رسول کی ضرورت اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسانوں ہی میں سے رسول بھیجے۔ کیوں کہ انسان کی رہنمائی کے لیے انسان ہی رسول ہو سکتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ
الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۙ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ
وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

(سورہ النحل ۴۴)

ترجمہ: ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں تو آدمی ہی بھیجے ہیں۔ جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اگر تم لوگ خود نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو۔ پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے (اسی طرح) روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔ اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے۔ تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح بیان کردو، جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کو خود اپنی زندگی میں قرآنی اصولوں پر مبنی ایک عملی مظاہرہ کرنا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ آکر پیغام سنا دیتے۔ بلکہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح بھی آپؐ کی ذمّہ داری تھی۔ پیغامِ الٰہی فرشتوں کے ذریعے سے بھی بھیجا جاسکتا تھا۔ مگر محض پیغام بھیجنے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس عظیم مقصد کی تکمیل و تعمیل کے لیے لازمی تھا کہ اس پیغام کو بنی نوعِ انسان ہی کا ایک فرد لے کر آئے جو کہ انسانِ کامل ہونے کے باوجود بہرحال انسان اور بشر ہو۔ اس کو مشکلات اور مجبوریوں کا اسی طرح سامنا کرنا پڑتا ہو جس طرح اس کی اُمّت کے ایک معمولی فرد کو۔ اور جو ساری دنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطورِ مثال رکھ دے جس کا اجتماعی نظام اسی پیغامِ الٰہی کے منشا کی شرح ہو۔

انبیاءؑ کی خصوصیّات

انبیاءؑ کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ **بشریت** ! اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہبری کے لیے ہمیشہ کسی انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ کسی جن یا فرشتے کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ

(سورۂ یوسف : ۱۰۹)

ترجمہ : اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے۔

انبیاء اگرچہ انسان ہوتے ہیں مگر اللہ تعالےٰ نے ان کو ایسے اوصاف سے نوازا ہوتا ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتے۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ انسان پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر تو کوئی فرشتہ ہونا چاہیے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝

(سورۃ الاسراء : ۹۵)

ترجمہ : اُن سے کہو کہ، اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے،
تو ہم اُن کے لیے آسمان سے ضرور کوئی فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے۔

۲۔ **امین** رسالت ایک ایسی نعمت ہے جو محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ کوئی شخص اپنی محنت و کاوش سے اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو محض عبادت و ریاضت سے حاصل ہو جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ جسے چاہے دے دے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ (سورۃ جمعہ ،

ترجمہ : یہ تو اللہ کا فضل ہے۔ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تاہم یہ منصب جن لوگوں کو عطا کیا گیا وہ تمام لوگ نیکی، تقویٰ، ذہانت اور عزم و ہمت جیسی بلند صفات کے مالک تھے۔

۳۔ تبلیغِ احکامِ الٰہی پیغمبر جو احکامات و تعلیمات لوگوں کے سامنے بیان فرماتا ہے وہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا ترجمان ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (سورۃ النجم: ۳،۴)

ترجمہ: اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔

۴۔ معصومیت اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر معصوم اور گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کے اقوال اور اعمال شیطان کے عمل دخل سے محفوظ ہوتے ہیں۔ نبیؑ کا کردار بے داغ ہوتا ہے۔ وہ ایسا انسانِ کامل ہوتا ہے جو بے حد روحانی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ نبیؑ کا کوئی کام نفسانی خواہشات کے تابع نہیں ہوتا۔

۵۔ واجب اطاعت انبیاؑ کی اطاعت و پیروی ضروری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔

(سُورۃ النساء: ۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اس کا حکم مانا جائے اللہ کے فرمانے سے۔

نبی، اللہ کا راستہ دکھاتا ہے اس لیے اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسی طرح پیغمبر کتاب اللہ کا شارح ہوتا ہے۔ اُمّت کا مُعلّم و مُربّی ہوتا ہے۔ اُمّت کے لیے نمونۂ تقلید ہوتا ہے۔ قانونِ الٰہی کا شارح ہوتا ہے و قاضی اور حَکَم ہوتا ہے۔

رسالتِ محمدیؐ اور اس کی خصوصیات

حضرت آدم علیہ السّلام سے نبوت کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ خاتم المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر آ کر اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیائے کرام کو جو کمالات علیحدہ علیحدہ عطا فرمائے تھے۔ نبی آخر الزماں صلّی اللہ علیہ

وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کی ذات میں وہ تمام شامل کر دیے۔ رسالتِ محمدیؐ بڑی نمایاں خصوصیات رکھتی ہے۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ عمومیت رسولِ اکرمؐ سے پہلے آنے والے انبیاء کی نبوت کسی خاص قوم یا ملک کے لیے ہوتی تھی مگر آپؐ کی نبوت قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا

(سورۃ الاعراف: ۱۵۸)

ترجمہ: (اے محمدؐ) تو کہہ، اے لوگو: میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف۔

۲۔ پہلی شریعتوں کا نسخ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کی شریعت نے آپؐ سے پہلے آنے والے انبیاءؑ کی شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ اب صرف شریعت محمدیؐ پر عمل کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ

(سورۃ آلِ عمران: ۸۵)

ترجمہ: اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ کاملیت حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ پر اللہ کے دین کی تکمیل ہو گئی۔ آپؐ کو وہ دین کامل عطا فرمایا گیا، جو تمام انسانیت کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کسی دوسرے دین کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ
وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ (سورۃ المائدہ: ۳)

ترجمہ: آج میں نے مکمل کر دیا تمہارے لیے دین تمہارا، اور پوری کر دی تم پر اپنی نعمت، اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

۴۔ حفاظتِ کتاب پہلے انبیاء پر نازل ہونے والی کتابیں یا تو بالکل ناپید ہو چکی

ہیں یا اپنی اصلی صورت میں باقی نہیں رہیں۔ کیونکہ ان میں بڑے پیمانے پر رد و بدل ہو چکا ہے۔ جس سے ان کتابوں میں صحیح اور غلط تعلیمات اس قدر گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ صحیح کو غلط سے جدا کرنا بے حد مشکل ہو گیا ہے مگر خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب قرآن کی آیات چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اسی شکل و صورت میں موجود ہیں جس طرح نازل ہوئی تھیں۔ اس کے ایک حرف میں بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ قرآن مجید نہ صرف یہ کہ تحریری طور پر محفوظ ہے بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں بھی موجود ہے۔

۵۔ سنتِ نبوی کی حفاظت اللہ کی طرف سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی حفاظت کا بھی عظیم انتظام کیا گیا ہے۔ ہر دور میں محدثینِ کرام کی ایسی جماعت موجود رہی جس نے سنت نبوی کی حفاظت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ چونکہ سنت، قرآن مجید کی شرح ہے جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اس لیے اللہ نے جس طرح قرآن مجید کی حفاظت کا انتظام کیا، اسی طرح سنت نبوی کی حفاظت کا انتظام بھی فرما دیا۔

۶۔ جامعیت پہلے انبیاء کی رسالت کسی خاص قوم اور دور کے لیے ہوتی تھی۔ اس لیے ان کی تعلیمات کا تعلق کسی قوم اور دور سے ہوتا تھا۔ مگر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ تمام انسانیت اور تمام زمانوں کے لیے رسول بن کر آئے۔ اس لیے آپ کی تعلیمات میں اس قدر جامعیت ہے کہ قیامت تک کے انسان خواہ کسی بھی قوم یا دور سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان تعلیمات سے رہبری حاصل کر سکتے ہیں۔

۷۔ ہمہ گیری رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے جو تعلیمات پیش فرمائیں ان کی حیثیت محض نظری نہیں رکھی بلکہ خود ان پر عمل کر کے اور انھیں عملی زندگی میں نافذ کر کے دکھایا۔ جب آپ کی حیاتِ طیبہ پر نظر ڈالی جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ خانگی زندگی ہو یا سیاسی، بچوں سے برتاؤ ہو یا بڑوں سے معاملہ۔ امن کا دور ہو یا جنگ کا زمانہ، عبادت کی رسمیں ہوں یا معاملات کی باتیں، قرابت کے تعلقات ہوں یا ہمسائگی کے روابط، زندگی

کے ہر پہلو میں سیرتِ محمدیؐ انسانوں کے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(سورۃ الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ: تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ (کی سیرت) میں بہترین نمونہ ہے۔

۸۔ ختمِ نبوت ختمِ نبوت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت کا جو سلسلہ شروع ہوا، اور یکے بعد دیگرے کئی انبیاءؑ آئے۔ کچھ کے پاس اپنی علیحدہ آسمانی کتابیں اور مستقل شریعتیں تھیں اور کچھ اپنے سے پہلے انبیاءؑ کی کتابوں اور شریعتوں پر عمل پیرا تھے۔ یہ سلسلہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آ کر ختم ہو گیا۔ آپؐ پر ایک جامع اور ہمیشہ رہنے والی کتاب نازل ہوئی اور آپؐ کو ایک کامل شریعت دی گئی۔ آپؐ آخری نبی ہیں۔ آپؐ پر دین کی تکمیل ہوئی اور آپؐ کی شریعت نے پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ آپؐ کے بعد اب کسی قسم کا کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا۔ کیوں کہ:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام انسانوں کے رسول بنا کر بھیجا ہے اور قیامت تک ہر قوم اور ہر دور کے انسانوں کے لیے آپؐ کی رسالت عام ہے اور سب کے لیے آپؐ کی تعلیم کافی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر دین کو مکمل کر دیا۔ آپؐ کی شریعت کامل ہے اور آپؐ کی تعلیمات ہدایت کی مکمل ترین شکل ہیں اس لیے اب کسی دوسرے نبی کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر نازل کردہ کتاب قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ کتاب چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اس شان سے محفوظ ہے کہ اس کے ایک حرف میں بھی کوئی رد و بدل نہیں ہو سکا۔ اس کتاب کا ایک ایک حرف محفوظ ہے۔ کاغذ کے صفحات پر بھی اور حفاظ کے

سینوں میں بھی۔ آپؐ کی تمام تعلیمات اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں جو تمام دنیا کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ اس لیے آپؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔ اب ہر طالبِ ہدایت پر لازم ہے کہ حضرت خاتم المرسلینؐ پر ایمان لائے اور آپؐ ہی کے بتائے ہوئے طریقے پر چلے۔

عقیدۂ ختم نبوت، قرآن، حدیث اور اجماعِ اُمت تینوں سے ثابت ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ
رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ (سورۃ الاحزاب: ۴۰)

ترجمہ: محمدؐ باپ نہیں کسی کے تمھارے مردوں میں سے لیکن اللہ کے رسول ہیں اور مُہر سب نبیوں پر۔

عربی زبان میں "ختم" کے معنی ہیں مُہر لگانا، بند کرنا، آخر تک پہنچانا، کسی کام کو پورا کرکے فارغ ہوجانا۔ تمام مفسرینؒ نے اس آیت کریمہ میں خاتم کے معنی آخری نبی کے بیان کیے ہیں۔ حدیث مبارک میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہِ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا: "بنی اسرائیل کی رہنمائی انبیاءؑ کیا کرتے تھے۔ جب ایک نبی وفات پاجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" ایک اور حدیث میں آتا ہے حضور صلّی اللہ علیہِ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا: "میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص نے عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی۔ مگر ایک کنارے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی اور وہ اینٹ میں ہوں۔"

تمام صحابۂ کرامؓ کا اس بات پر اجماع تھا کہ حضور صلّی اللہ علیہِ وآلہٖ وسلّم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں جن لوگوں نے دعوئ نبوت کیا، صحابۂ کرامؓ نے ان کے خلاف جہاد کیا۔

ملائکہ پر ایمان

ملائکہ کا لفظ جمع ہے۔ اس کا واحد "مَلَک" ہے جس کے لفظی معنی پیغام رساں

کے ہیں۔ چونکہ یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں تک لاتے اور نافذ کرتے ہیں اس لیے انھیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ فرشتے نورانی مخلوق ہیں اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔

ملائکہ یا فرشتوں پر ایمان لانا، دین کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ ملائکہ کے وجود اور ان کے کاموں کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد آیات ملتی ہیں ۔ جن ے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابع مخلوق ہے اور ان سے گناہ یا خطا کا صدور ممکن نہیں۔ تخلیقِ انسانی کے وقت بھی فرشتے موجود تھے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ ے جذبۂ اطاعت کے تحت عرض کیا تھا کہ زمین میں کوئی اور خلیفہ (انسان) پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ہر حکم کی تعمیل کے لیے دست بستہ موجود ہیں۔ فرشتے اطاعت و عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ (سورۃ الاعراف ٢٠٦)

ترجمہ : ملائکہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں۔

فرشتوں کے ذمے اللہ تعالیٰ نے مختلف کام لگا رکھے ہیں، جو وہ پوری تندہی سے سرانجام دیتے ہیں۔ چار فرشتے بہت مشہور ہیں۔ ان میں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام انبیاءِ کرام کے پاس وحیِ الٰہی لانے کا کام کرتے رہے ہیں۔ حضرت میکائیل علیہ السلام کے ذمے بارشوں اور ہواؤں کے نظام کی نگرانی ہے۔ مَلَکُ الْمَوْت حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ذمے جان دار مخلوقات کی اَرواح قبض کرنا ہے۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ذمے قیامت برپا کرنے اور پھر مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اللہ کے حکم سے صور پھونکنا ہے۔

اپنی بنیادی تخلیق اور ادائگی فرض کے لحاظ سے فرشتوں کی کئی قسمیں اور درجے ہیں۔ سورۂ فاطر میں ہے :

رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ (سورۃ الفاطر : ١)

ترجمہ: ایسے پیغام رساں فرشتے موجود ہیں جن کے دو دو تین تین اور چار چار
بازو ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہے اضافہ
کرتا ہے۔

فرشتے نورانی مخلوق ہیں البتہ یہ حسبِ ضرورت مختلف جسمانی شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت مریم سلام اللہ علیہا، حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حضرت لوط علیہ السّلام کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے مختلف انسانی شکلوں میں ظاہر ہوئے۔ حضرت جبرائیل علیہ السّلام بعض اوقات حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مجلس میں انسانی شکل میں ظاہر ہوئے۔

اسی طرح اللہ نے ہر انسان کے ساتھ ایسے فرشتے مقرر کر دیے ہیں جو اسے حادثات اور مضر اشیاء سے بچاتے رہتے ہیں۔ مؤمنوں اور نیکی کے کام اختیار کرنے والوں کے لیے مغفرت اور نزولِ رحمت کی دعائیں کرتے ہیں۔ مشکل حالات میں دل کو تسلّی اور بشارتیں دیتے ہیں اور نیکی کے کاموں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ
الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ
الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ (سورۂ حٰم سجدہ: ۳۰)

ترجمہ: جن لوگوں نے اقرار کیا کہ اللہ ہمارا پالنے والا ہے پھر اس قول پر
ثابت قدم رہے، تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ)
نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنّت کی بشارت سے جس کا تم سے
وعدہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہر انسان کے اعمال کی نگرانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر کر دیے ہیں جو اس کے ہر چھوٹے بڑے عمل کو محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ جو کہ قیامت کے دن اعمال ناموں کی شکل میں ہر شخص کے سامنے پیش کر دیے جائیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ (سورۃ الانفطار: ۱۱)

ترجمہ، بے شک تم پر نگران (فرشتے) مقرر کیے گئے ہیں۔ بہت معزز (اور تمھارے) اعمال لکھنے والے۔

اسی طرح ارشاد ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (سورۂ ق ۱۸)

ترجمہ۔ جو لفظ بھی اس (انسان) کے منہ سے نکلتا ہے اس کو محفوظ کرنے کے لیے ایک چست نگران (فرشتہ) موجود ہے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھانے، انسانوں کے اعمالنامے پیش کرنے، جہنم میں مجرموں کو سزا دینے اور جنت میں نیکوکاروں کی خدمت کرنے کے تمام کام مختلف فرشتوں کے سپرد ہیں۔

فرشتوں پر ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا شعور بڑھتا ہے۔ اس کے قائم کردہ عظیم الشان نظام اور بے پایاں رحمتوں کا احساس ہوتا ہے۔ فرشتوں کی موجودگی پر ایمان کی وجہ سے انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ میرے ہر چھوٹے بڑے عمل کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اسی طرح میدانِ جہاد اور دین کے مشکل کاموں میں فرشتوں کی تسلیاں، ثابت قدمی کا باعث اور ان کی دعائیں انسانوں کی مغفرت کا ذریعہ بنتی ہیں۔

آسمانی کتابیں

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تمام رسولوں پر ایمان لایا جائے۔ رسولوں پر ایمان لانے کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا سچا پیغمبر مانا جائے اور ان کی تعلیمات کو برحق تسلیم کیا جائے۔ رسولوں پر نازل ہونے والی کتابیں ان ربّانی تعلیمات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا رسولوں پر ایمان لانے کے لیے لازم ہے کہ ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر بھی ایمان لایا جائے۔ ایمان والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ

اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج (سُورۃ البقرۃ : ۴)

ترجمہ : اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر، جو نازل ہوا تیری طرف، اور اس پر، جو نازل ہوا تجھ سے پہلے۔

کل آسمانی کتابیں بہت سی ہیں جن میں سے چار بہت مشہور ہیں :

۱۔ زبور جو حضرت داؤد عَلَیْہِ السَّلام پر نازل ہوئی۔
۲۔ توریت جو حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام پر نازل ہوئی۔
۳۔ انجیل جو حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلام پر نازل ہوئی۔
۴۔ قرآن مجید جو حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم پر نازل ہوا۔

ان کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت آدمؑ اور دوسرے انبیا کے صحیفے بھی تھے۔ ان تمام کتابوں میں دین کی بنیادی باتیں مشترک تھیں۔ جیسے اللّٰہ تعالیٰ کی توحید، اس کی صفاتِ کاملہ، اللّٰہ تعالیٰ کی عبادت، رسالت پر ایمان، یومِ آخرت پر ایمان اور اعمال کی جزا و سزا۔ مگر چونکہ ہر دور میں وقت کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اس لیے شریعت کے تفصیلی قوانین ان کتابوں میں جدا جدا تھے۔ بعد میں آنے والی کتابوں نے پہلی کتابوں کے تفصیلی قوانین کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح قرآن نے جو کہ سب کتابوں کے بعد نازل ہوا، پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ اور اب صرف قرآن کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا لازم ہے۔ پہلی کتابوں کے بتائے ہوئے قوانین پر نہیں۔ پہلی کتابوں پر ایمان لانے کا اب مطلب یہ ہے کہ وہ بھی سچی کتابیں تھیں اور ان کے بیان کردہ قوانین پر ان کے زمانے میں عمل کرنا ضروری تھا۔ مگر اب صرف قرآنی ہدایات ہی پر عمل کیا جائے گا۔

آخری آسمانی کتاب قرآن مجید اللّٰہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو آخری پیغمبر حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم پر نازل ہوئی اور قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے یہ سرچشمۂ ہدایت ہے۔ قرآن مجید

کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں :

۱۔ محفوظ ہونا چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے ہر دَور اور ہر قوم کے انسانوں کے لیے رُشد و ہدایت کا ذریعہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا خاص وعدہ فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

(سُورۃ الحجر ۱ ۹)

ترجمہ : ہم نے خود اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود قرآنِ مجید کا ایک ایک لفظ محفوظ ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تحریف (ردّ و بدل) سے محفوظ ہو گیا ہے جب کہ دوسری آسمانی کتابوں میں بڑا ردّ و بدل ہو چکا ہے ان کا بہت سا حصہ ضائع ہو چکا ہے اور جو باقی بچا اس میں بھی لوگوں نے اپنی طرف سے کئی باتیں شامل کر دیں۔ اب یہ کتابیں کہیں بھی اپنی اصلی شکل میں دستیاب نہیں۔ جب کہ قرآن مجید اپنی خاص شکل میں اب تک موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔

۲۔ قرآن کی زندہ زبان قرآن مجید جس زبان میں نازل ہوا وہ ایک زندہ زبان ہے۔ آج بھی دنیا کے بیس سے زیادہ ممالک کی قومی زبان عربی ہے اور یہ زبان دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ جب کہ پہلی آسمانی کتابیں جن زبانوں میں نازل ہوئیں وہ مردہ ہو چکی ہیں، جن کو سمجھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔

۳۔ عالمگیر کتاب باقی آسمانی کتابوں کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صرف کسی ایک خاص ملک یا خاص قوم کے لوگوں کے لیے تھیں۔ مگر قرآن مجید ساری دنیائے انسانیت کے لیے پیغامِ ہدایت ہے۔ یہ کلام پاک یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ (اے لوگو) کا خطاب کر کے تمام انسانوں کو ہدایت کا پیغام دیتا ہے۔ یہ ایک عالمگیر کتاب ہے، جس کی تعلیمات ہر دَور اور ہر مُلک میں قابلِ عمل ہیں۔

اس کتاب کی تعلیمات فطری ہیں اس لیے کہ ہر دور کا انسان یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے یہ اسی کے دور کے لیے نازل ہوئی ہے۔ کیوں کہ اس کی تعلیمات ہر قوم و ملک اور ہر طرح کے ماحول میں بسنے والے افراد کے لیے یکساں طور پر نفع بخش اور عقل کے عین مطابق ہیں۔

٤۔ جامع کتاب پہلی آسمانی کتابوں میں سے کچھ کتابیں صرف اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھیں۔ بعض صرف مناجات اور دعاؤں کا مجموعہ تھیں۔ کچھ صرف فقہی مسائل کا مجموعہ تھیں۔ بعض میں صرف عقائد کا بیان تھا اور بعض صرف تاریخی واقعات کا مجموعہ تھیں۔ مگر قرآن مجید ایسی جامع کتاب ہے جس میں ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں عقائد و اعمال کا بیان بھی ہے اخلاق و روحانیت کا درس بھی ہے۔ تاریخی واقعات بھی ہیں اور مناجات بھی غرضیکہ یہ ایسی جامع کتاب ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتی ہے۔

٥۔ عقل و تہذیب کی تائید کرنے والی کتاب پہلی آسمانی کتابوں میں سے بعض کتابیں ایسی باتوں پر بھی مشتمل ہیں جو حقیقت کے خلاف ہیں بلکہ بعض کتابوں میں انتہائی ناشائستہ غیر اخلاقی باتیں بھی پائی جاتی ہیں (ظاہر ہے یہ باتیں جعلی ہیں جو کسی نے اپنی طرف سے شامل کر دی ہیں) جب کہ قرآن مجید ایسی تمام باتوں سے پاک ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو خلافِ عقل ہو اور جسے تجربہ اور دلیل سے غلط ثابت کیا جا سکے۔ اس میں کوئی غیر اخلاقی بات نہیں۔ اس نے تمام انبیاءؑ کا ادب و احترام سکھایا اور سب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ نیکوکار اور پرہیزگار لوگ تھے۔ ان کی شان کے خلاف جتنی بھی باتیں کہی گئی ہیں سب جھوٹ اور خلافِ واقعہ ہیں۔

٦۔ قرآن مجید کا اعجاز قرآن مجید فصاحت و بلاغت کا وہ شاہکار ہے، جس کا مقابلہ کرنے سے عرب و عجم کے تمام فصیح و بلیغ لوگ عاجز رہے۔ قرآن مجید میں سب مخالفوں کو دعوت دی گئی ہے کہ ایک چھوٹی سی قرآنی سورت کے مقابلے میں کوئی سورت بنا دو مگر کوئی بھی اس کا مقابلہ پیش نہ کر سکا۔ کیوں کہ یہ تو خدا کا کلام ہے کسی بندے کا بنایا ہوا کلام نہیں

پھر کوئی بشر اس کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟

آخرت

اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدۂ آخرت بھی ہے:

مفہوم لفظ "آخرت" کے معنی بعد میں ہونے والی چیز کے ہیں۔ اس کے مقابلے میں لفظ "دنیا" ہے۔ جس کے معنی قریب کی چیز کے ہیں۔ عقیدۂ آخرت کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی روح باقی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب اللہ تعالیٰ اس کی روح کو جسم میں منتقل کرکے اسے دوبارہ زندہ کر دے گا اور پھر انسان کو اس کے نیک و بد اعمال کا حقیقی بدلہ دیا جائے گا۔ نیک لوگوں کو ایک ایسی جگہ عنایت کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بھرپور ہوگی۔ اس کا نام جنت ہے اور بُرے لوگ ایک انتہائی اذیت ناک جگہ میں رہیں گے جس کا نام جہنم ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝

(سورۂ انفطار: ۱۳، ۱۴)

ترجمہ: بے شک نیک لوگ بہشت میں رہوں گے، اور بے شک گناہ گار دوزخ میں۔

آخرت کے سلسلے میں قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ انسان کی دنیاوی زندگی اس کی آخرت کی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ دنیا کی زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی دائمی ہے۔ انسان کے تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مرتب نہیں ہوتے۔ بلکہ اس عارضی زندگی میں جن اعمال کا بیج بویا جاتا ہے ان کے حقیقی نتائج آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔

۲۔ جس طرح دنیا کی ہر چیز علیحدہ علیحدہ اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہوتے ہی وہ چیز ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہوتے ہی یہ نظام ختم ہو جائے گا، اور ایک دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا۔

۳۔ جب دنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ایک دوسرا نظام قائم ہوگا۔ تو انسان کو ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی۔ اس روز ایک زبردست عدالت لگے گی جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اسے نیک اعمال کی جزا ملے گی اور برے اعمال کی سزا۔

منکرین آخرت کے شبہات اور ان کا قرآنی جواب قرآن مجید میں عقیدۂ آخرت کو بیان کرتے ہوئے منکرین کے شبہات کا بڑے عمدہ انداز میں جواب دیا گیا ہے۔

مشرکین مکہ عقیدۂ آخرت کے منکر تھے۔ اس سلسلے میں ان کے شبہات یہ تھے:

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ

(سورۃ السجدہ : ۱۰)

ترجمہ: اور کہتے ہیں کیا جب ہم زمین میں نیست و نابود ہوں گے تو کیا ہمیں
پھر ہم نئے جنم میں آئیں گے۔

مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ۝ (سورۃ یٰسٓ ۷۸)

ترجمہ: کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں۔

لہٰذا:

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝

(سورۃ الانعام : ۲۹)

ترجمہ: زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ اور ہم مرنے کے بعد ہرگز
دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے شبہات کو دور کرتے ہوئے فرمایا۔ تم پہلے موجود نہ تھے۔ تمھیں اللہ نے موجود کیا۔ جو ذات تمھیں پہلے وجود میں لانے پر قادر ہے وہ تمھارے مرجانے کے بعد تمھیں دوبارہ زندگی بخشنے پر بھی قادر ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ
وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ

(سورۃ الروم : ۲۷)

ترجمہ : اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اس کے لیے بہت ہی آسان ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ
وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۙ (سورۂ یٰس ۷۹)

ترجمہ : (اس سے) کہو انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔

كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ
يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ (سورۃ البقرۃ : ۲۸)

ترجمہ : تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی بخشی پھر تمھیں مارے گا۔ پھر وہی تمھیں زندگی دے گا۔ پھر اس کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔

انسان کی صحیح سوچ اس سے عقیدۂ آخرت پر ایمان لانے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ نیک عمل کا اچھا صلہ اور برے عمل کا برا بدلہ ہوتا ہے۔ لیکن کیا انسان کے تمام اعمال کے نتائج اس دنیاوی زندگی میں سامنے آجاتے ہیں؟ ایسا نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات ایک ایسا شخص جس نے پوری زندگی گناہوں میں گزاری ہو اس جہان میں سزا سے بچا رہتا ہے۔ اسی طرح بعض بے حد نیک لوگ جو عمر بھر نیکیاں کرتے رہے انھیں یہاں نیکی کا پورا بدلہ نہ ملا بلکہ بعض کو تو بے حد اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے۔ کیا مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا کبھی نہیں ملے گی؟ کیا نیکوکار اچھے اجر سے محروم رہیں گے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل ان کے بارے میں ہمیشہ کے لیے خاموش رہے گا؟ کیا اشرف المخلوقات انسان کو عبث پیدا کیا گیا اور اس کے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں؟

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ

سورۂ مومنون ۱۱۵

ترجمہ : سو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمھیں

ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔

جب عقل کی پہلو پر سے حق ہے تو یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ آخرت کی زندگی برحق ہے جس میں سب لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ نیک لوگوں کو ان کے عمل کا بہت اچھا بدلہ ملے گا اور مجرموں کو سخت سزا ملے گی۔ سوائے ان کے جن کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے۔

اسلام میں عقیدۂ آخرت کی اہمیت آخرت پر ایمان رکھنا اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے۔ قرآن مجید میں اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں متقین کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اگر آخرت پر ایمان نہ ہو تو انسان خود غرضی اور نفس پرستی میں ڈوب کر تہذیب و شرافت اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو یکسر بھول جائے اور انسانی معاشرے میں جنگل کا قانون رائج ہو جائے۔

عقیدۂ آخرت انسانی معاشرے کو انسانیت افروز بنانے کا اہم ذریعہ ہے کیوں کہ اس سے انسان کے دل میں نیکی پر جزا اور بدی پر سزا کا احساس ابھرتا ہے جو اعمال میں صالحیت پیدا کر دیتا ہے۔

جو شخص آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے اس کی نظر اپنے اعمال کے صرف ان ہی نتائج پر نہیں ہوتی جو اس زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ان نتائج پر بھی نظر رکھتا ہے جو آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ اسے جس طرح زہر کے بارے میں ہلاک کرنے اور آگ کے بارے میں جلنے کا یقین ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہوں کے ہلاکت خیز ہونے کا بھی یقین ہو جاتا ہے اور جس طرح وہ غذا اور پانی کو اپنے لیے مفید سمجھتا ہے اسی طرح نیک اعمال کو بھی اپنے لیے نجات و عزت کا سبب سمجھتا ہے۔ عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر بڑے اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں

۱۔ **نیکی سے رغبت اور بدی سے نفرت** جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ جانتا

کہ اس کے تمام اعمال خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ اس کے نامۂ اعمال میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ آخرت میں یہی نامۂ اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوگا اور منصفِ حقیقی فیصلہ فرمائے گا۔ اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ ایک پلڑے میں نیک اعمال اور دوسرے میں برے اعمال ہوں گے۔ اگر نیکی کا پلڑا بھاری ہوا تو کامیابی حاصل ہوگی اور جنت میں ٹھکانہ ہوگا اور اگر برائیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو ناکامی ہوگی اور جہنم کا دردناک عذاب چکھنا ہوگا۔

آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص برائیوں سے نفرت کرنے لگتا ہے کیوں کہ اسے علم ہوتا ہے کہ ان کے نتیجے میں وہ عذاب میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اسے نیکیوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اسے نیکی کا اجر ضرور ملے گا۔

۲۔ بہادری اور سرفروشی ہمیشہ کے لیے مٹ جانے کا ڈر انسان کو بزدل بنا دیتا ہے۔ مگر جب دل میں یہ یقین موجود ہو کہ اس دنیا کی زندگی چند روزہ ہے۔ پائدار اور دائمی زندگی آخرت کی ہے تو انسان نڈر ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے سے بھی نہیں کتراتا۔ وہ جانتا ہے کہ راہِ حق میں جان کا نذرانہ پیش کر دینے سے وہ ہمیشہ کے لیے فنا نہیں ہو جائے گا بلکہ آخرت کی کامیاب اور پُرمسرت زندگی حاصل کرے گا۔ چنانچہ یہ عقیدہ مؤمن کے دل میں جذبۂ سرفروشی پیدا کر کے معاشرے میں امن اور نیکی کے پھیلنے کی راہیں ہموار کر دیتا ہے۔

۳۔ صبر و تحمل عقیدۂ آخرت سے انسان کے دل میں صبر و تحمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حق کی خاطر جو بھی تکلیف برداشت کی جائے گی۔ اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر ملے گا۔ لہٰذا آخرت پر نظر رکھتے ہوئے وہ ہر مصیبت کا صبر و تحمل سے مقابلہ کرتا ہے۔

۴۔ مال خرچ کرنے کا جذبہ عقیدۂ آخرت انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ حقیقی زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے۔ لہٰذا اسی دولت سے لگاؤ رکھنا چاہیے جو اس زندگی کو کامیاب بنائے چنانچہ مؤمن جتنا بھی دولت مند ہو جاتا ہے۔ اسی قدر زیادہ سخاوت اور فیاضی کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کی آخرت کی زندگی سنور جائے گی۔

۵۔ احساسِ ذمہ داری آخرت پر ایمان رکھنے سے انسان میں احساسِ ذمہ داری

پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرنا جرم ہے جس پر آخرت میں سزا ملے گی لہٰذا پوری ذمہ داری سے اپنے فرائض ادا کیے جائیں۔ آہستہ آہستہ یہ احساس اس قدر پختہ ہو جاتا ہے کہ انسان اپنا ہر فرض پوری دیانت داری سے انجام دینے لگتا ہے خواہ اس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہو یا خدا کے حقوق سے۔

سوالات

۱۔ اسلام کے بنیادی عقائد کو الگ الگ بیان کرتے ہوئے ان پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۲۔ قرآنی دلائل کی روشنی میں وجود باری تعالیٰ پر بحث کریں۔

۳۔ شرک کسے کہتے ہیں؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

۴۔ خاتم النبیین کی حیثیت سے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خصوصیات بیان کریں۔

۵۔ آسمانی کتابوں پر مفصل تبصرہ کریں۔

۶۔ انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کے اثرات بیان کریں۔

۷۔ آخرت کے عقیدے پر قرآن مجید کی روشنی میں بحث کریں۔

۸۔ ملائکہ سے کیا مراد ہے؛ نیز کراماً کاتبین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۹۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے:

نفخِ صور، عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر اثرات۔
مشہور ملائکہ کے نام اور کام

باب دوم

اِسلامی تشخّص

اسلامی تشخّص سے مراد ایسے تمام عقائد و نظریات اور اعمال و اخلاق ہیں، جو ایک مسلمان کو دوسرے تمام انسانوں سے الگ اور ممتاز کرتے ہیں۔

ارکانِ اسلام

ارکان رکن کی جمع ہے جس کے معنی "ستون" ہیں۔ رکن ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر کسی عمارت کے قائم رہنے کا دار و مدار ہو۔ یہاں ارکانِ اسلام سے مراد دین کے وہ بنیادی اصول و اعمال ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت قائم ہے۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا ارشادِ گرامی ہے:

بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ
الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ

(بخاری۔ مسلم)

ترجمہ: اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر اٹھائی گئی ہے۔ (۱) اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم اللہ کے بندے اور اس کے (آخری) رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا۔ اور زکوٰۃ دینا۔ اور حج کرنا۔ اور رمضان کے روزے رکھنا۔

کلمۂ شہادت ارکانِ دین میں سب سے اہم کلمۂ شہادت ہے جس کے الفاظ ہیں:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ

وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا
کوئی شریک نہیں اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ
وآلہٖ وسلم اس کے بندے اور اس کے آخری رسول ہیں۔

اللہ کو ایک ماننے کا عقیدہ اسلام میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے جس کے بغیر کوئی انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز پر انسان کا یقین اتنا پختہ ہو جائے کہ اس میں شک و شبہے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ انسانی زندگی میں عقیدے کی اہمیت اور اس کے اثرات کا تذکرہ توحید کے باب میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقیدۂ توحید انسان کو قناعت اور بے نیازی کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو حرص، حسد اور لالچ سے نجات دلاتا ہے اور انسان کے دل میں یہ پختہ تاثیر پیدا کرتا ہے کہ صرف ایک اللہ ہی خالق و رازق ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ عزت و ذلت اور حکومت و دولت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔ نہ نفع۔ وہ جس کو جو کچھ عطا کرتا ہے ایک مصلحت کے تحت اور آزمائش و امتحان کی غرض سے عطا کرتا ہے۔ اور پھر وہ جسے جو کچھ دینا چاہتا ہے کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور جسے کسی چیز سے محروم کرنا چاہتا ہے کوئی دوسرا اسے دے نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ایک اللہ کو ماننے کا عقیدہ انسان کو اس کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام چھوٹے بڑے۔ ظاہر و پوشیدہ اعمال سے واقف ہے۔ اسے غلط کاری اور گناہ گاری سے محفوظ رکھتا ہے اور اسے معاشرے کا ایک مفید اور ذمہ دار شہری بناتا ہے۔

کلمۂ شہادت کا پہلا حصہ یعنی اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عقیدۂ توحید ہی کا اعلان و اعتراف ہے۔ کلمۂ شہادت کا دوسرا حصہ یعنی اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اس امر کا اعلان ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ

محمد صلعم اللہ تعالیٰ کے بندے اور سچے رسول ہیں۔ اور آپؐ کا پیش کردہ دین ہی دینِ حق ہے۔ ان دونوں باتوں کی گواہی دیئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ گو بظاہر توحید و رسالت دو چیزیں ہیں، لیکن درحقیقت دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کو مانے بغیر کوئی شخص رسولؐ کو مان سکتا ہے، اور نہ رسولؐ کو تسلیم کیے بغیر اللہ تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے۔ اور چونکہ رسولؐ پر ایمان لانے کے مفہوم میں آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کو تسلیم کرنا شامل ہے، جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ دل کی تمام خواہشات شریعتِ اسلامی کے تابع ہو جائیں۔ جیسا کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمنِ کامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کے دل کی تمام خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔

انسانی عظمت کا ضامن عقیدہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے اپنے قول و عمل سے توحید و رسالت کی گواہی دی اور اپنے تمام انفرادی و اجتماعی معاملات میں شریعت اسلامی کی کماحقہٗ پیروی کا اہتمام کیا تو وہ انسانی عظمت کی بلندیوں پر جا پہنچے۔ لیکن جب یہ گواہی دلی تصدیق اور عملی اطاعت سے محروم ہو کر رہ گئی تو ہماری عزت و عظمت خاک میں مل گئی۔

نماز اسلام ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کو چند اعتقادات ہی دے دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ان کی پوری زندگی کو ان اعتقادات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے عبادات کا ایک نظام مقرر کرتا ہے۔ جو نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے اور سب سے اہم جزو نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشادات میں سے ایک ارشاد ہے:

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سورۃ روم ۳۱)

ترجمہ: تم قائم رکھو نماز اور مت ہو شرک کرنے والوں میں۔

نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی بہت سی احادیث، نماز کی تاکید پر مشتمل ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے:

رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُوْدُہُ الصَّلٰوۃُ

ترجمہ: دین کی اصل بنیاد خدا اور رسول کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے اور اس عمارت کا ستون نماز ہے۔

نماز کے لیے قرآن میں صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے لفظی معنی دعا ہیں۔ مگر شرعی اصطلاح میں نماز اس خاص طریقے سے عبادت کرنے کا نام ہے، جو ہمیں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے سکھایا اور اس کے متعلق ارشاد فرمایا:

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ۔ یعنی نماز دین کا ستون ہے۔

نماز کی تاکید نماز چونکہ دینی تربیت کا اہم ترین حصہ ہے اس لیے ہر امت پر فرض رہی ہے اور تمام انبیاءؑ اپنی امتوں کو نماز کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ قرآن مجید میں نماز پڑھنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ نماز قائم کرنے والے فلاح پائیں گے اور اسے ترک کرنے والے ذلت و خواری کا شکار ہوں گے۔ ایک آیت میں مذکور ہے کہ جب عذاب کے فرشتے جہنمیوں سے عذاب پانے کی وجہ دریافت کریں گے تو وہ اپنے جہنم میں پھینکے جانے کی وجہ یہ بتائیں گے:

لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (سورۃ المدثر: ۴۳)

ترجمہ: (وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے۔

دل و زبان سے اللہ کو معبود تسلیم کرنے کے بعد اس کے سب سے اہم حکم، نماز کی ادائگی سے انحراف ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کو معبود ماننے سے انکار کے برابر ہے۔ اس لیے نبی کریمؐ نے فرمایا:

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (ترمذی)

ترجمہ: جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی، اس نے کافرانہ روش اختیار کی۔

نماز قربِ خداوندی کا سب سے مؤثر وسیلہ ہے۔ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

کا ارشاد ہے:

اِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا صَلّٰی یُنَاجِیْ رَبَّہٗ (بخاری)

ترجمہ: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو گویا اپنے رب سے چپکے چپکے بات چیت کرتا ہے۔

اسی اہمیت کے پیشِ نظر قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا۔

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

اَوَّلُ مَا سُئِلَ عَنِ الصَّلٰوۃِ۔

ترجمہ: (قیامت کے روز) سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

نماز کے فوائد (۱) اللہ تعالیٰ کے سامنے بندے کی دن میں پانچ بار حاضری اس کے دل میں یہ احساس تازہ رکھتی ہے کہ وہ صرف اور صرف اللہ کا بندہ ہے۔ بندگی کا یہ احساس متواتر نماز پڑھنے سے ایک مسلمان کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے اور اس کی پوری زندگی تعمیلِ احکامِ خداوندی کا عملی نمونہ بن جاتی ہے۔

(۲) دن میں پانچ مرتبہ قربِ الٰہی کا احساس مسلمان کو یقین دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کے ساتھ ہے۔ وہ کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا احساس اسے گناہ کے کاموں سے روکتا اور اس کے دل سے ہر قسم کا خوف اور غم دور کرتا ہے۔

(۳) نمازوں کے درمیانی وقفے میں بھی نمازوں کے اثرات جاری و ساری رہتے ہیں۔ نماز کے بعد گناہ کا خیال آئے تو بندہ سوچتا ہے کہ ابھی تو اپنے اللہ سے دعا کر کے آیا ہوں کہ گناہوں سے بچا، اور ابھی گناہ کا کام کروں گا تو کچھ دیر بعد اس کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ یہ چیز اسے مستقل طور پر گناہ سے روکے رکھتی ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سلسلے میں پانچ بار باہم ملنے والے افراد کے درمیان محبت و یگانگت پیدا ہوتی ہے جس سے سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔

(۵) نماز باجماعت اور بطورِ خاص جمعے اور عیدین کی نمازوں سے مسلمانوں میں اجتماعیت کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلمان رنگ، نسل، علاقے اور طبقے کے امتیازات سے بے نیاز ہو کر شانے سے شانہ ملا کر ایک امام کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تو اس سے ان کے درمیان فکری وحدت کے ساتھ ساتھ عملی مساوات کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔

(۶) اجتماعی شکل میں انجام پانے والے اعمال کی کیفیات، انفرادی اعمال کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ اسی لیے اجتماعی نماز کا ثواب انفرادی نماز کے مقابلے میں ستائیس گنا ہوتا ہے۔

(۷) نمازیوں کو مسجد میں آتے جاتے دیکھ کر بے نمازوں کو ترغیب و تحریک ہوتی ہے اور وہ بھی نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

(۸) نماز میں امام کا اتباع اور اس کی پیروی، اجتماعی نظم و ضبط کا شعور پیدا کرتی ہے۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے تو نماز باجماعت کے لیے مسجد میں نہ پہنچنے والے افراد کے لیے فرمایا تھا کہ جو لوگ نماز کے لیے مسجد میں نہیں آتے۔ اگر مجھے ان کے بیوی بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کے گھروں میں آگ لگوا دیتا۔

بے روح نمازیں نماز کی ادائگی کے متذکرہ بالا فوائد و ثمرات آج ہمیں کیوں نہیں حاصل ہوتے؟ غور فرمائیے! ہم میں سے کتنے افراد ہیں جو نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہیں؟ اس کے الفاظ و کلمات کے معنی و مفہوم سے آشنا ہیں؟ کتنے لوگ نماز میں حضوریِ قلب سے بہرہ مند ہیں؟ اور نماز کے اہم ترین مقصد سے بخوبی آگاہ ہیں، کہ ان کی نماز انھیں بدی و بے حیائی سے روکتی ہو، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (سورۃ العنکبوت، ۴۵)

ترجمہ: بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بری بات سے۔

درحقیقت آج ہماری نمازیں بے مقصد ہیں، ایسے ہی جیسے کوئی پھول ہو، بغیر خوشبو کے! یا قالب ہو، بغیر روح کے!

روزہ روزہ بھی اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ اس کے لیے قرآن و حدیث میں "صوم" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی اپنے آپ کو روکنا ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں روزے سے مراد "صبحِ صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک اللہ کی خوشنودی کے لیے بعض مخصوص اُمور کی سرانجام دہی اور کھانے پینے سے اپنے آپ کو روکے رکھنا ہے جو روزے کے علاوہ دوسرے ایام میں جائز ہے۔ قرآن حکیم کے بیان کے مطابق یہ پہلی امتوں پر بھی فرض رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا
كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝

(سورۃ البقرہ : ۱۸۳)

ترجمہ : اے ایمان والو، فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

مذکورہ بالا آیت سے جہاں روزے کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے وہاں اس کو فرض کرنے کی حکمت بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ ہے تقویٰ کا حصول! جس سے مراد پرہیزگاری اور اللہ تعالیٰ کا خوف ہے اور یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو انسان کو برائیوں سے روکتی اور نیکیوں کی طرف راغب کرتی ہے۔

ضبطِ نفس انسان کو نیکی کے راستے سے روکنے اور برائی کے راستے پر ڈالنے والی اہم چیز خواہشِ نفس ہے۔ خواہشات اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع رہیں تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی خوبیوں کے فروغ کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن جب یہ خواہشاتِ نفسانی ہدایتِ ربانی کے تابع نہیں رہتیں، تو انسان کو حیوانی سطح سے بھی گرا دیتی ہیں۔ روزے کا اصل مقصد انسان کی خواہشات کو احکامِ الٰہی کے تابع کر کے اسے متقی بنانا ہے۔ جو شخص ہر سال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر پورا مہینہ اپنی بنیادی خواہشات پر قابو پانے کی مشق کامیابی سے مکمل کر لے تو اسے ضبطِ نفس کی وہ قوت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ شیطان کی ہر طرح کی ترغیب کا آسانی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

جب ایک انسان رمضان کے پورے مہینے میں کھانے پینے اور نفسانی خواہشات پر قابو رکھتا ہے نیز دیگر اخلاقی برائیوں سے اجتناب کرتے ہوئے اپنا اکثر وقت عبادات اور نیک کاموں میں گزارتا ہے تو اس کی طبیعت میں نیکی کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے اور اسے بدی سے نفرت ہو جاتی ہے۔

روزہ خواہشاتِ نفسانی پر قابو پانے کی تربیت کے ساتھ ساتھ انسان کی انانیت (خود پسندی) کا بھی مؤثر علاج ہے۔ جب انسان روزے میں بھوک اور پیاس کی شدت کے باوجود کھانے پینے کی اشیاء پاس ہوتے ہوئے بھی کچھ کھا پی نہیں سکتا تو اسے خدا تعالیٰ کے سامنے اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس جب دائمی کیفیت بن جائے تو انسان میں ہر خلافِ شریعت عمل سے رُک جانے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ہے "ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے گئے روزوں سے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔" اور یہ بھی فرمایا ہے "بہت سے روزے دار ایسے ہیں کہ جن کو اپنے روزوں سے بھوک اور پیاس کی اذیت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا" آپؐ نے مزید فرمایا ہے کہ:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ
حَاجَةٌ فِيْٓ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (بخاری)

ترجمہ، اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹ اور غلط کاریوں سے نہیں بچتا، تو اس کا کھانا، چھڑانے سے اللہ کو کوئی دلچسپی نہیں۔

روزوں کا ثواب جو روزے نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے قول کے مطابق ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے جائیں۔ ان کے ثواب کا اندازہ درج ذیل حدیثوں سے ہوگا:

"كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ
اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى
اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ" (مسلم)

ترجمہ: آدمی کے ہر عمل کا ثواب (اللہ تعالیٰ کے یہاں) دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہوتا ہے، لیکن روزے کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مگر روزہ تو خاص میرے لیے ہے۔ اس لیے اس کا ثواب میں اپنی مرضی سے (جتنا چاہوں گا) دوں گا۔

مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ مَغْفِرَةً لِذُنُوْبِهٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْئًا (سنن ابن ماجہ۔ ترمذی)

ترجمہ: جو شخص اس (رمضان) میں کسی روزے دار کو افطار کرائے گا وہ اس کے گناہوں کے لیے معافی ہے اور خود کو، جہنم سے بچائے گا، اور اسے روزے دار جتنا ہی ثواب ملے گا۔ جب کہ اس روزے دار کے اپنے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

روزے کے اجتماعی فوائد یوں تو روزہ ایک انفرادی عبادت ہے، لیکن اس کے درج ذیل اجتماعی فوائد بھی ہیں:

(۱) مہینہ بھر بھوکا پیاسا رہ کر انسان کو دوسرے کی بھوک پیاس کا احساس ہوتا ہے اور دل میں ناداروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

(۲) کم سے کم غذا پر اکتفا کی عادت، انسان میں قناعت و ایثار کی صفات پیدا کرتی ہے۔

(۳) ایک ہی وقت میں پوری ملتِ اسلامیہ کا ایک عبادت میں مصروف رہنا، باہمی یگانگت کے فروغ کا سبب بنتا ہے۔ اس اعتبار سے نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ نے ماہِ رمضان کو مواسات اور غمگساری کا مہینہ قرار دیا ہے۔

(۴) ایک مدت تک دن کے بڑے حصے میں معدے کا خالی رہنا صحتِ جسمانی کے لیے مفید ہوتا ہے۔

رمضان المبارک اور قرآن حکیم | ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ
وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ
الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ (سورۃ البقرہ : ۱۸۵)

ترجمہ: مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینے کو تو ضرور روزے رکھے اس کے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید اور رمضان کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ قرآن کے مضامین انسان کی ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ ہیں اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی اوّلین شرط تقویٰ ہے جو انسان میں روزے کے ذریعے نشو و نما پاتی ہے۔ اس لیے رَمَضَان میں قرآن کی شب و روز تلاوت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اس کا بے انتہا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ اور نمازِ تراویح کی بھی یہی غرض اور مصلحت ہے۔

رمضان اور پاکستان | یوں تو رمضان المبارک پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے رحمت و مغفرت کا مہینہ ہے لیکن ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے اس مہینے اور اس کی ایک مبارک شب کی خاص اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک رات میں ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی۔ رمضان کی ستائیسویں شب کو پاکستان کی تشکیل گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ تھی کہ اس مملکتِ خداداد میں اسی کتاب مقدس کا نظامِ زندگی نافذ کیا جائے جو اس مبارک شب میں نازل ہوئی اور ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا بھی اسی غرض سے تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ حیات نافذ کیا جائے۔ اس اعتبار سے رمضان المبارک تشکیلِ پاکستان کی سالگرہ اور خدا تعالیٰ سے کیے ہوئے ہمارے عہد کی تجدید کا بھی موقع ہے۔

بے اثر روزے | آج ہمارے روزوں کے وہ فیوض و برکات ظاہر نہیں ہوتے، جن کا ہم اوپر کی سطور میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم روزے کے

اصل مقصد تقویٰ (ضبط نفس) سے بے خبر ہیں۔ اس کی اہم شرائط، ایمان اور احتساب دونوں سے غافل ہیں۔ جس طرح عام طور پر ہماری نمازیں دکھاوے کی ہیں، ویسے ہی ہمارے روزے بھی بالعموم نمائشی ہو گئے ہیں۔

زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معاشی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے۔ کہ قرآن میں اکثر مقامات پر ادائگی نماز کے ساتھ ادائگی زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ نماز اگر بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ نظام زکوٰۃ کی حیثیت کے پیش نظر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زکوٰۃ کی ادائگی کا انکار کرنے والوں سے جہاد کیا۔ باوجودیکہ وہ کلمہ گو تھے اور فرمایا کہ میں اپنی زندگی میں ان دونوں فرائض کی تعمیل میں کوئی فرق نہیں ہونے دوں گا۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی پاک کرنے کے ہیں۔ جو انسان زکوٰۃ ادا کرتا ہے وہ خدا کے حکم کے مطابق نہ صرف اپنے مال کو پاک کر لیتا ہے، بلکہ اس کے ذریعے اپنے دل کو بھی دولت کی ہوس سے پاک کرتا ہے۔ اور دولت کے مقابلے میں اللہ کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور اسی کے حکم پر اپنی دولت کو قربان کرتا ہے۔ ادائگی زکوٰۃ اسے یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ جو دولت وہ کماتا ہے وہ حقیقت میں اس کی ملکیت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے۔ یہ احساس اسے معاشی بے راہ روی سے بچاتا اور اس کے تمام معاشی اعمال کو احکام الٰہی کا تابع کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد کے مطابق معاشی معاملات دین کا اہم حصہ ہیں۔ جب انسان دولت جیسی نعمت اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے اس ایثار کی قدر کرتے ہوئے اس قربان شدہ مال کو اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ فرماتا ہے کہ بندے کا یہ قرض وہ کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا۔ ارشاد ربانی ہے:

إِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۙ (سورۃ التغابن ۱۷)

ترجمہ۔ اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا دو گنا کر دے اس کو تمہارے لیے اور تم

کو بخشے اور اللہ قدردان ہے اور تحمل والا۔

اس کے مقابلے میں جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

(سورۃ التوبہ: ۳۴)

ترجمہ: اور جو لوگ سونا اور چاندی گاڑھ کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو دردناک عذاب کی خبر دیجیے۔

ان آیات کی رو سے زکوٰۃ کی ادائگی انسان کے لیے آخرت کی نعمتوں کے حصول اور عذابِ جہنم سے نجات کا ذریعہ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔

معاشی فوائد (۱) سودی نظام معیشت میں محنت کے مقابلے میں چونکہ سرمایہ کی افادیت کہیں زیادہ ہے اس لیے محنت کش اور کارکن طبقہ مسلسل غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ مختلف طریقوں سے اس طبقے کی دولت ہتھیاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح معاشی نظام مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ زکوٰۃ اس صورتِ حال کا بہترین حل ہے۔ نظامِ زکوٰۃ کے ذریعے دولت کا ایک حصہ امیر طبقے سے غریب طبقے کی جانب بھی مڑ جاتا ہے۔ جس سے غریب لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ (سورۃ البقرہ: ۲۷۶)

ترجمہ: اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔

(۲) ادائگی زکوٰۃ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے پیدا ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لیے صاحب مال اپنی دولت کسی نہ کسی منفعت بخش کاروبار میں لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کی شرح کیوں کہ صرف ڈھائی فیصد ہے۔ لہٰذا صاحب مال یہ رقم دیگر قسم کے بھاری ٹیکسوں کے مقابلے میں

خوش دلی اور دیانت داری سے ادا کرتا ہے اور اپنا سرمایہ پوری آزادی سے کاروبار میں لگاتا ہے۔ جب کہ بھاری ٹیکسوں کی ادائگی کے خوف سے سرمایہ چھپانے کا رجحان بڑھتا ہے، جس سے ملکی معیشت کمزور ہو جاتی ہے۔

معاشرتی فوائد معاشرے میں دولت کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں خون کی۔ اگر یہ سارا خون دل (یعنی مالدار طبقے میں) جمع ہو جائے تو پورے اعضائے جسم (یعنی عوام) کو مفلوج کر دینے کے ساتھ ساتھ خود دل کے لیے بھی مضر ثابت ہوگا۔ اگر ایک طرف مفلس طبقہ ناداری کے مصائب سے دوچار ہوگا تو دوسری طرف صاحبِ ثروت طبقہ دولت کی فراوانی سے پیدا ہونے والے اخلاقی امراض (مثلاً عیاشی، آرام کوشی اور فکرِ آخرت سے غفلت شعاری) کا شکار ہو جائے گا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ان طبقوں میں حسد اور حقارت کے علاوہ کوئی اور رشتہ باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کشیدگی بڑھتی ہی جائے گی اور کسی نہ کسی بہانے ضرور رنگ لا کر رہے گی۔

ان تمام انفرادی و اجتماعی فوائد ہی کے پیشِ نظر، حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کو مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام کے فوراً بعد یہ ہدایت کی گئی:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا

(سورۃ التوبہ: ۱۰۳)

ترجمہ: ان کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کرو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی، پاک کرتے ہو اور (باطن میں بھی) پاکیزہ بناتے ہو۔

زکوٰۃ کے مصارف تقسیم زکوٰۃ کی مدات بھی اللہ تعالیٰ نے خود متعین فرما دی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ
عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ
وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (سورۃ توبہ: ۶۰)

ترجمہ: زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے رستے میں اور راہ کے مسافر کو ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس آیت کی رو سے مندرجہ ذیل مصارف زکوٰۃ معلوم ہوئے۔

۱۔ ان تنگ دست لوگوں کی اعانت جن کے پاس کچھ نہ ہو۔
۲۔ ان لوگوں کی اعانت جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہوں۔
۳۔ زکوٰۃ کی وصولی پر متعین عملے کی تنخواہیں۔
۴۔ ان لوگوں کی اعانت جو نومسلم ہوں تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو سکے۔
۵۔ غلاموں اور ان لوگوں کو آزاد کرنے کے مصارف جو قید و بند میں ہوں۔
۶۔ ایسے لوگوں کے قرضوں کی ادائگی جو نادار ہوں۔
۷۔ جہاد فی سبیل اللہ اور تبلیغ دین میں جانے والوں کی اعانت میں۔
۸۔ مسافر جو حالت سفر میں مالک نصاب نہ ہو، گو مکان پر دولت رکھتا ہو۔

جب اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو تو زکوٰۃ حکومت کے سپرد کر دینا لازم ہوگا تاکہ وہ اپنے طور پر بہتر طریقے سے مقررہ مدّات میں زکوٰۃ تقسیم کر سکے۔ البتہ اگر کسی خطۂ زمین پر مسلمان کسی غیر اسلامی حکومت کے زیرِ فرمان آ جائیں۔ تو اس صورت میں ہر فرد اپنے طور پر ان مذکورہ مدّات پر خرچ کر سکتا ہے۔

مسائل زکوٰۃ زکوٰۃ ان لوگوں پر فرض ہے جن کے پاس ایک خاص مقدار میں سونا، چاندی، روپیہ یا سامان تجارت ہو۔ اس خاص مقدار کو نصاب کہتے ہیں۔ مختلف اشیاء کا نصاب یہ ہے:

۱۔ سونا۔ ساڑھے سات تولے۔
۲۔ چاندی۔ ساڑھے باون تولے۔

۳۔ روپیہ، پیسہ اور سامان تجارت۔ سونے چاندی دونوں میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر۔

زکوٰۃ کسی مال پر اس وقت واجب ہوتی ہے۔ جب اسے جمع کیے ہوئے پورا ایک سال گزر چکا ہو۔

ادائیگیِ زکوٰۃ کے چند اصول۔ (مسائل): ۱۔ زکوٰۃ صرف مسلمانوں سے ہی لی جاتی ہے۔

۲۔ وہ عزیز و اقارب جن کی کفالت شرعاً فرض ہے۔ (مثلاً ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، شوہر، بیوی وغیرہ) انھیں زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ البتہ دور کے عزیز، غیروں کے مقابلے میں قابل ترجیح ہیں۔

۳۔ عام حالات میں ایک بستی کی زکوٰۃ خود اسی بستی میں تقسیم ہونی چاہیے۔ البتہ اس بستی میں مستحقین زکوٰۃ کے نہ ہونے، یا کسی دوسری بستی میں ہنگامی صورت حال مثلاً سیلاب، زلزلہ، قحط وغیرہ کے مواقع پر دوسری بستی میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

۴۔ زکوٰۃ دینے والوں کو چاہیے کہ وہ ممکن حد تک یہ اطمینان کریں کہ زکوٰۃ لینے والا اس کا مستحق ہے۔

۵۔ زکوٰۃ کی رقم سے ضرورت کی اشیاء خرید کر بھی مستحقین کو دی جا سکتی ہیں۔

۶۔ مستحق زکوٰۃ کو بتانا ضروری نہیں کہ یہ پیسہ یا مال زکوٰۃ کا ہے۔

الحمدللہ! ہمارے ملک میں نظام زکوٰۃ کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی کامیابی کے لیے ہر ممکن تعاون کریں۔ تاکہ اس کی برکت سے ہمارا معاشرہ دنیا کے لیے مشعلِ راہ بن سکے۔

زکوٰۃ کے جملہ فوائد و ثمرات تبھی ظاہر ہو سکتے ہیں جب ہر صاحب مال اللہ جل شانہٗ کی خوشنودی کو اپنا لائحہ عمل بنائے اور [illegible] کے فیض رسانی اور نفع بخشی کے جذبے کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ خصوصاً زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام اجتماعی طور پر قائم و دائم ہو۔

حج ارکانِ اسلام میں حج کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے بخوبی ہوتا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ
سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(سورۂ آل عمران: ۹۷)

ترجمہ: اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی اور جو نہ مانے تو پھر اللہ پروا نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

حج کی غرض و غایت چند خاص مقامات کی صرف زیارت ہی نہیں، بلکہ اس کی پشت پر ایثار، قربانی، محبت اور خلوص کی ایک درخشاں تاریخ موجود ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ جیسی عظیم ہستیوں کے خلوص و عزیمت کی بے مثال داستان ہے۔ اللہ نے ۸۶ سال کی عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک بیٹا دیا۔ اس کا نام اسماعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس اکلوتے بیٹے کو اس کی ماں کے ساتھ ایک غیر آباد اور ویران وادی میں چھوڑ آنے کا حکم دیا گیا۔ جس پر خود انھوں نے بھی بڑے صبر و حوصلہ سے عمل کیا اور حضرت ہاجرہ نے بھی اس سلسلے میں بڑی عزیمت کا مظاہرہ کیا۔ جب یہ بچہ کچھ بڑا ہوا اور دوڑ دھوپ کے قابل ہو گیا تو اسے قربان کرنے کا حکم دیا گیا۔ اللہ کے اس عظیم بندے ابراہیم علیہ السلام نے اس پر بھی بڑی استقامت سے عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اس قربانی کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا، وہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی بچا لیا۔ جنھوں نے تسلیم و رضا کی عظیم الشان مثال پیش فرمائی تھی۔ حج کے متعدد مناسک ہمیں انھی عظیم اور بزرگ ہستیوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔

حج ایک جامع عبادت ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ گناہوں کی بخشش ہے۔ نبی اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ

وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ (بخاری)

ترجمہ: جو کوئی خالصۃً اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حج کرتا ہے اور دوران حج فسق و فجور سے باز رہتا ہے وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو کر لوٹتا ہے گویا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

اپنے گناہ گار بندوں کو دنیا ہی میں پاک صاف کر دینے کا یہ انتظام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی دلیل ہے۔ لہٰذا اس سے فائدہ نہ اٹھانا حد درجے کی ناشکری اور بدبختی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا ارشاد ہے۔

مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ اَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ فَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ اِنْ شَآءَ يَهُوْدِيًّا وَاِنْ شَآءَ نَصْرَانِيًّا۔

ترجمہ: جس (صاحب استطاعت) شخص کو نہ کوئی ظاہری ضرورت حج سے روک رہی ہو، نہ کوئی ظالم بادشاہ اس کی راہ میں حائل ہو اور نہ کوئی روکنے والی بیماری اسے لاحق ہو اور پھر بھی اس نے حج نہیں کیا۔ پس چاہے وہ مرے یہودیت پر یا نصرانیت پر۔

جامعیت حج جیسی جامع عبادت میں تمام عبادات کی روح شامل ہے۔ حج کے لیے روانگی سے واپسی تک دوران سفر نماز کے ذریعے قرب الٰہی میسر آتا ہے۔ حج کے لیے مال خرچ کرنا زکوٰۃ سے مشابہت رکھتا ہے۔ نفسانی خواہشات اور اخلاقی برائیوں سے پرہیز اپنے اندر روزے کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ گھر سے دوری اور سفر کی صعوبت میں جہاد کا رنگ ہے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "سب سے افضل جہاد حجِ مبرور (مقبول) ہے۔" آپؐ کے اسی ارشاد گرامی کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ فرمایا کرتے۔ "حج کا سامان تیار رکھو کہ یہ بھی ایک جہاد ہے۔"

زائرین خانۂ کعبہ کی کیفیات اگر حج کے مناسک پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہر مرحلہ اپنے اندر اخلاقی و روحانی تربیت کا سامان رکھتا ہے۔ جب ایک شخص اپنے

عزیز و اقارب کو چھوڑ کر اور دنیوی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر، دو ان سلی چادریں لپیٹ کر "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ" کی صدائیں بلند کرتے ہوئے، بیت اللہ شریف میں حاضر ہوتا ہے، تو اس کا یہ سفر ایک طرح سے سفرِ آخرت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اس دینی ماحول اور پاکیزہ فضا میں جب وہ مناسک حج ادا کرتا ہے، تو اس کی حالت ہی عجیب ہوتی ہے۔ میدانِ عرفات کے قیام میں اسے وہ بشارت یاد آتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی صورت میں مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام فرمائی ہے۔ اسے حضور اکرمؐ کے مبارک خطبے کی بے مثال ہدایات یاد آتی ہیں۔ اسے یہ حکم یاد آتا ہے کہ میرے بعد گمراہی سے بچنے کے لیے قرآن اور حدیث کو مضبوطی سے تھامے رہنا۔ قربانی کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ کی بے نظیر قربانی یاد آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے اس قربانی کے مقابلے میں میرے نفس کی چھوٹی موٹی خواہشات کی قربانی کی حقیقت ہی کیا ہے؟ میرا تو مرنا جینا بھی خدا ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ ایسے میں اس کے قلب و ذہن پر یہ کلمات بے ساختہ جاری ہو جاتے ہیں!

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا
أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (سورۃ الانعام : ۶۲ ۶۳)

ترجمہ: بیشک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لیے ہے، جو پالنے والا سارے جہانوں کا ہے۔ کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔

مقامِ منیٰ میں وہ اس عزم کے ساتھ اپنے ازلی دشمن شیطان کو کنکریاں مارتا ہے کہ اب اگر یہ میرے اور میرے اللہ کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرے گا تو اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کروں گا۔ جب وہ بیت اللہ کے سامنے پہنچتا ہے تو اس کی روح اس خیال سے وجد میں آجاتی ہے، کہ جس مقدس گھر کی زیارت کے لیے آنکھیں نمناک تھیں، دل مضطرب تھا وہ آج نظر کے سامنے ہے۔ خدا سے لو لگائے رکھنے کی یہ کیفیت حاجی کے

لیے تسکین اور روح کی مسرت کا باعث بنتی ہے۔ طواف کے بعد وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے تو گویا زبانِ حال سے کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرے قرب سے حاصل ہونے والی اس قوتِ ایمانی کو میں تیرے دین کی سربلندی کے لیے وقف کر دوں گا اور عمر بھر حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کروں گا۔ دل کی یہی تمنا دعا بن کر اس طرح لبوں تک آتی ہے:

اَللّٰهُمَّ اسْتَعْمِلْنِیْ بِسُنَّةِ نَبِیِّكَ وَتَوَفَّنِیْ عَلٰی مِلَّتِهٖ
وَاَعِذْنِیْ مِنْ مُضِلَّاتِ النَّفْسِ۔

ترجمہ۔ اے میرے اللہ! مجھے اپنے نبیؐ کے طریقے پر کاربند رکھ۔ اور اس پر عمل کرتے ہوئے مجھے اپنے پاس بلا لے اور نفسانی لغزشوں سے مجھے محفوظ فرما دے۔

فوائد ۔ حج کا اصل فائدہ یادِ الٰہی اور تقربِ خداوندی ہے۔ لیکن دیگر ارکانِ دین کی طرح اس کے بھی متعدد معاشرتی و اخلاقی فوائد ہیں۔ اس موقع پر دنیا کے مختلف علاقوں سے آنے والے افراد فریضۂ حج کی ادائیگی کی بدولت گناہوں سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ایمان اور تقویٰ کی پاکیزگی کی جو دولت لے کر لوٹتے ہیں وہ ان کے ماحول کی بھی اصلاح کا سبب بن جاتی ہے۔

(۲) حج کا یہ عظیم الشان اجتماع ملتِ اسلامیہ کی شان و شوکت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمان، رنگ و نسل، قوم و وطن کے امتیازات سے بلند و بالا ہو کر بیک زبان ایک ہی کلمہ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ دہراتے ہیں۔ ایک ہی کیفیت میں سرشار اپنے خدا کی پکار پر لپکے جا رہے ہوتے ہیں تو گویا وہ خدا کے فداکار سپاہیوں کی ایک فوج معلوم ہوتے ہیں۔

(۳) حج کا ایک اہم تجارتی اور اقتصادی فائدہ یہ بھی ہے کہ مختلف ممالک سے آنے والے حجاج خرید و فروخت کے ذریعے معاشی نفع حاصل کرتے ہیں۔

حجِ مقبول حج کے مذکورہ بالا اجتماعی و انفرادی فوائد سے ہم تبھی فیضیاب ہو سکتے ہیں جب ہمارا مقصد رضائے الٰہی ہو اور ہماری سرگرمیوں کا مرکز و محور دینِ حق کی سربلندی

ہو اور حج کے روحانی مقاصد پر نظر جمی رہے۔ تبھی ہمارا حج، حجِ مقبول و مبرور ہو سکتا ہے۔

جہاد

جہاد کا مفہوم جہاد کے لغوی معنی کوشش کے ہیں اور دینی اِصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش ہے جو دین کی حفاظت، فروغ اور اُمّتِ مسلمہ کے دفاع کے لیے کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو اس دنیا کا حاکم مان لینے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنی زندگی کے جملہ معاملات میں اس کے احکام کی پیروی کرے۔ نیز اس کے مقابلے میں کسی اور کا حکم نہ چلنے دے۔ اگر کوئی طاقت "اقتدارِ اعلیٰ" اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا قانون نافذ کرنا چاہے تو وہ جان پر کھیل کر اس کا مقابلہ کرے۔ اسلام کی جملہ عبادات انسان میں یہی جذبۂ فداکاری پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس جذبے کے بغیر نہ اسلام کی بقا ممکن ہے، نہ فروغ۔

اقسامِ جہاد جہاد کی کئی اقسام ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ خواہشِ نفس کے خلاف جہاد انسان کو اطاعتِ الٰہی سے روکنے والی پہلی قوت انسان کی اپنی خواہشات ہیں، جو ہر وقت اس کے دل میں موجزن رہتی ہیں۔ انسان کو ان کی سرکوبی کے لیے ہر وقت چوکنّا رہنا چاہیے۔ لہٰذا خواہشاتِ نفس کے خلاف جہاد کو نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے "جہادِ اکبر" کا نام دیا ہے۔ اور یہ جہاد کا وہ مرحلہ ہے جسے طے کیے بغیر انسان جہاد کے کسی اور میدان میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

۲۔ شیطان کے خلاف جہاد اپنے نفس پر قابو پا لینے کے بعد ان شیطانوں سے نمٹنا ضروری ہوتا ہے جو اللہ کے بندوں کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے بہلا کر اپنی اطاعت اور بندگی پر مجبور کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اس قسم کی ہر قوت کو "طاغوت" کا نام دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ
كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (سورۃ النساء: ٧٦)

ترجمہ: جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں سو لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں۔

یہ طاغوتی قوتیں اسلامی معاشرے کے اندر غلط رسم و رواج کی شکل میں بھی پائی جاتی ہیں اور اسلامی معاشرے کے باہر غیر اسلامی ممالک کے غلبے کی شکل میں بھی۔ چنانچہ ان طاغوتی طاقتوں سے نمٹنے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ کہیں ان سے زبان و قلم کے ذریعے نمٹا جاتا ہے اور کہیں قوت و طاقت کے ذریعے۔ اس بارے میں قرآن مجید ایک جامع ہدایت دیتا ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (سورۃ النحل: ١٢٥)

ترجمہ: اور ان سے ایسے انداز میں بحث و تمحیص کرو جو بہت اچھا ہو۔

اگر جہاد کا سچا جذبہ دل میں موجزن ہو تو مؤمنانہ بصیرت ہر موقع پر مناسب راہیں سُجھا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا یہ فرمان بہترین رہنمائی کرتا ہے:

مَنْ رَّاٰیْ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ
یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَ
ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔ (مسلم)

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی بُدی کو دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے (قوت سے) روکے۔ اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا سمجھے اور یہ (بدی کو محض دل سے برا سمجھنا) ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

جہاد بالسیف حق و باطل کی کشمکش میں وہ مقام آکر رہتا ہے۔ جب طاغوتی قوتیں حق کا راستہ روکنے اور اسے مٹانے کے لیے سرِ جنگ سے آگے بڑھ کر کھلی جنگ پر اتر آتی

ہیں اور مسلمانوں کو ملّی تحفظ اور بقائے دین کے لیے ان سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں:

اوّل۔ مدافعانہ جہاد۔ اگر کوئی غیر مسلم قوت کسی مسلمان ملک پر حملہ کر دے تو اس ملک کے مسلمانوں پر اپنے دین و ایمان، جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی خاطر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ مسلمان ممالک اور اسلامی معاشرے کو غیر مسلموں کے تسلط سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں جو بھی کوشش کی جائے گی، وہ جہاد شمار ہو گی۔ مدافعانہ جہاد کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم ریاست کی مسلمان رعایا پر محض اس کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ظلم و ستم ڈھایا جا رہا ہو تو عالمِ اسلام اسے ظلم و ستم سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

دوم۔ مُصلحانہ جہاد۔ جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر اللہ کی حاکمیت اور نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی اِطاعت کا اِقرار کرتا ہے اس پر لازم آتا ہے کہ وہ ساری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیّت اور نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی شریعت نافذ کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی بعثت کا ایک اہم مقصد دینِ حق کا قیام بتایا ہے:

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ
لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝

(سورۃ التوبہ: ۳۳)

ترجمہ: اس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر اور پڑے برا مانیں مشرک۔

مزید برآں ارشادِ خداوندی ہے:

وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰی لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّیَكُوۡنَ
الدِّیۡنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ

(سورۃ الانفال: ۳۹)

ترجمہ: اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جاوے حکم سب اللہ کا۔

جہاد اور جنگ میں فرق مخالفین اسلام ہمارے دین کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ دین تلوار کے زور سے پھیلا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ مسلمان کی تلوار اور کافر کی شمشیر، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کافر کی جنگ کا مقصد کسی مخصوص فرد، گروہ یا قوم کی ہوسِ ملک گیری، جذبۂ برتری یا معاشی غلبے کے جذبے کی تسکین ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر ممکن ظلم، دہشت گردی اور سفاکی سے کام لیتا ہے اور کامیاب ہو جانے کی صورت میں مفتوحین کی جان و مال اور عزت و آبرو، غرض کہ ہر چیز کو غارت کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان کے جہاد کا مقصد انسانوں کو طاغوتی قوتوں کے غلبے سے نجات دلانا، ان کے شرف، اور ان کی آزادی کو بحال کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ جہاد کا پابند رکھتا ہے جس میں اس کی ذاتی منفعت کا شائبہ تک شامل نہیں ہوتا۔ اس کی تلوار کی زد محض برسرِ جنگ افراد تک محدود رہتی ہے اور پھر جب وہ فتح حاصل کرتا ہے تو مفتوح قوم کو اپنے جذبۂ انتقام کا نشانہ بنانے کی بجائے ان کے لیے امن و سلامتی کی فضا فراہم کرتا ہے اور انھیں اسلام کی ان برکات سے بہرہ ور کرتا ہے جس کے تحت تمام انسانوں کے حقوق یکساں ہیں۔ چنانچہ جب غیر مسلم رعایا کو مسلمانوں کا نظام عدل، نظام تمدن، طرز معاشرت، حکومت اور نظامِ عبادات پسند آجاتا ہے تو وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس ذہنی تبدیلی کا سہرا تلوار کے سر نہیں۔ بلکہ اسلامی تعلیمات و مجاہدین اسلام کے حسن کردار کے سر ہے۔ تلوار کا کام تو صرف اتنا ہے کہ اسلام کے عادلانہ نظام اور عوام الناس کے درمیان جو لادینی قوتیں رکاوٹ بنی ہوں ان کا صفایا کر دے۔

جہاد کے فضائل قرآن حکیم اور احادیث میں جہاد کے متعدد فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا
كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (سورۃ الصف ۴)

ترجمہ: بے شک اللہ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار

باندھ کر گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "قسم ہے اللہ کی جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر دنیا وما فیہا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے اور اللہ کی راہ میں دشمن کے مقابل آکر ٹھہرے رہنے کا ثواب گھر میں ستر نمازوں سے زیادہ ہے۔" بلاشبہ یہ جہاد کی عظمت وفضیلت اور شہادت کی تڑپ ہی کا جذبہ تھا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان دنیا پر چھائے رہے اور دشمنانِ اسلام کے دلوں پر ان کی عظمت وشوکت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت واطاعت

اللہ تعالیٰ کے احسانات اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف زندگی ہی نہیں دی بلکہ زندگی بسر کرنے کے تمام لوازم بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس کی عنایتوں کا شمار اور اس کے کرم کا حساب ممکن نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (سورۂ ابراہیم: ۳۴)

ترجمہ: اور اگر تم اللہ کے احسانات گنوگے تو شمار نہیں کرسکوگے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ نعمتوں کی یہ کثرت وفراوانی انسان کے دل میں اپنے رحیم وکریم آقا کے لیے وہ جذبۂ محبت واحسان مندی نہ پیدا کرے جس کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۃ بقرہ: ۱۶۵)

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، ان کی اللہ کے ساتھ زیادہ شدید محبت ہے۔

رسولؐ اللہ کے احسانات اللہ تعالیٰ کے بعد ہماری محبت کے مستحق اس کے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپؐ کی ذات بابرکات ہے، جن کی محنتوں کے طفیل ہمیں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت، دولتِ دین میسر آئی۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ

تعالیٰ کی راہ میں جس قدر تکالیف مجھے دی گئیں کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔ اور وہ سب تکالیف آپ نے اس غرض سے برداشت کیں کہ امت آخرت کی تکالیف سے بچ جائے۔ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی محبت کے بارے میں ارشادِ نبویؐ ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ
وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اپنے والدین، اپنی اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

شرطِ محبت۔ اطاعتِ رسولؐ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اطاعتِ رسولؐ کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ

(سورۂ آل عمران: ۳۱)

ترجمہ: تو کہہ: اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری پیروی کرو (اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا)
خود اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اطاعت کی یہ شرط کچھ ہمارے نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے: جتنے انبیاءؑ دنیا میں بھیجے گئے ان کی بعثت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام پر ان کی پیروی کے ذریعے عمل پیرا ہو سکے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ

(سورۃ النساء: ۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اس کا حکم مانا جائے اللہ کے فرمانے سے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حوضِ کوثر پر ایسے لوگوں کو حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے دیدار سے محروم کر دیا جائے گا، جنہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے آپ کی پیروی کرنے کی بجائے دین میں نئی نئی باتیں نکال لی تھیں۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے:

كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى قِيلَ
وَمَنْ أَبَى؟ قَالَ مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ
عَصَانِي فَقَدْ أَبَى۔

ترجمہ: میرا ہر امتی جنت میں جائے گا، سوائے اس کے جو انکار کر دے۔ عرض کیا گیا کہ انکار کرنے والا شخص کون ہو گا؟ ارشاد فرمایا۔ جو شخص میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں جائے گا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ انکار کرنے والا ہو گا۔

حقوق العباد

معاشرتی زندگی میں اگر سب لوگوں کو ان کے جائز حقوق ملتے رہیں تو وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی صلاحیتیں معاشرے کی ترقی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور اس طرح ماحول خوشگوار بن سکتا ہے۔ جسے حسنِ معاشرت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آپس میں ایک دوسرے کا حق مارنے کی روش بے چینی اور کشمکش پیدا کرتی ہے۔ اس سے معاشرے کا نظم بگڑتا ہے اور تخریبی رجحانات تعمیری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بھی انسان کو اپنی ہدایات سے محروم نہیں رکھا۔ اس نے انسانوں کے درمیان حقوق کا واضح تعین کر کے ان کی ادائگی کو اپنی خوشنودی اور ادا نہ کرنے کو اپنی ناخوشی کا سزاوار ٹھہرایا۔ چنانچہ ایک سچا مسلمان حقوق العباد کو بھی حقوق اللہ ہی کی طرح محترم سمجھتا اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

والدین کے حقوق معاشرے میں انسان کو جن ہستیوں سے سب سے زیادہ مدد ملتی ہے وہ والدین ہیں جو محض اس کے وجود میں آنے کا ذریعہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کی پرورش اور تربیت کا بھی سامان ہوتے ہیں۔ دنیا میں صرف والدین ہی کی ذات ہے جو اپنی راحت اولاد کی راحت پر قربان کر دیتی ہے۔ ان کی شفقت اولاد کے لیے رحمتِ باری کا وہ سائبان ثابت ہوتی ہے۔ جو انھیں مشکلاتِ زمانہ کی دھوپ سے بچا کر پروان چڑھاتی ہے۔ انسانیت کا وجود اللہ تعالیٰ کے بعد والدین ہی کا مرہونِ منت ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اپنے بعد ان ہی کا حق ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا ۚ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ
كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا
كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ
وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝

(سورۃ الاسراء: ۲۳،۲۴)

ترجمہ: اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں تو نہ کہہ ان کو ہوں! اور نہ جھڑک ان کو۔ اور کہہ ان سے بات ادب کی اور جھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کر کے، نیازمندی سے اور کہہ اے رب ان پر رحم کر جیسا پالا انھوں نے مجھ کو چھوٹا سا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ والدین کا نافرمان شخص جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بوڑھے والدین کی خدمت پر بہت زور دیا ہے، کیوں کہ وہ اپنی زندگی کی صلاحیتیں اور توانائیاں اولاد پر صرف کر چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے اولاد کا فرض ہے کہ ان کے بڑھاپے کا سہارا بن کر احسان شناسی کا ثبوت دے۔ ایک بار آپ نے صحابہ کرامؓ کی محفل میں ارشاد فرمایا: "ذلیل و خوار ہو۔ ذلیل و خوار ہوا۔ ذلیل و خوار ہوا۔" صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا۔ "کون؟ یا رسول اللہ۔" ارشاد فرمایا۔ "وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی۔"

اولاد کے حقوق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ایک زمانے میں انسان کی سنگ دلی اس درجے کو پہنچ گئی تھی

کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر ڈالتا۔ اسلام نے انسان کے دل میں سوئے ہوئے جذبۂ رحم والفت کو جگایا اور دنیا سے قتلِ اولاد کی سنگ دلانہ رسم کا خاتمہ کیا اور اولاد کو اپنے والدین سے محبت وشفقت کی نعمت ایک بار پھر ملی۔ قرآنِ حکیم میں معاشرے کی دیگر برائیوں کے ساتھ قتلِ اولاد سے بھی ان الفاظ میں منع فرمایا:

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ
وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (سورۃ الاسراء: ۳۱)

ترجمہ اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے، ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے۔

ایک صحابیؓ نے نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم سے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ، سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ "شرک"۔ انھوں نے دریافت کیا "اس کے بعد"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "والدین کی نافرمانی!" عرض کیا۔ "اس کے بعد"۔ ارشاد ہوا۔ "تم اپنی اولاد کو اس خوف سے مار ڈالو کہ وہ تمھارے کھانے میں حصہ بٹائے گی۔"

تعلیماتِ اسلامی کے تحت والدین پر اولاد کے متعدد حقوق عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) زندگی کا حق۔
(۲) بنیادی ضروریات کی فراہمی، یعنی کھانے پینے، رہائش اور علاج کا حق۔
(۳) حسبِ مقدور تعلیم وتربیت کا حق۔

اگر والدین یہ جملہ حقوق بحسن وخوبی ادا کرتے رہیں تو نہ صرف یہ کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، بلکہ ان کی اولاد ان کے بڑھاپے کا سہارا بنتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اولاد کے حقوق کی ادائگی پر اپنے آرام وآسائش کو مقدم رکھتے ہیں۔ ان کی اولاد ان کی آخری عمر میں انھیں بے سہارا چھوڑ دیتی ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ جہاں اپنی اولاد کو روزی کمانے کے قابل بنانے کی تدبیر کرتے رہیں وہاں ان میں فکرِ آخرت بھی پیدا کریں اور عملِ صالح کی تربیت دیں۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کی ذمے داری

کو بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

(سورۃ التحریم: ٦)

ترجمہ: اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے۔

بلاشبہ والدین اگر خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق اپنی اولاد کے حقوق بطریق احسن ادا کریں اور اسے نیکی کی راہ پر لگائیں، تو نہ صرف یہ کہ وہ دنیا میں ان کی راحت کا سامان بنے گی بلکہ آخرت میں بھی ان کی بخشش کا ذریعہ ہوگی۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق معاشرے کی بنیادی اکائی گھر ہے اور گھر کے سکون اور خوشحالی کا انحصار میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات پر ہے۔ اس کی عمدگی محض دو افراد ہی کی نہیں بلکہ دو خاندانوں اور اس کے نتیجے میں پورے معاشرے کی شادمانیوں کا سبب بنتی ہے۔ اگر ان کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو یہ صورت حال بہت سے رشتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زوجین کے حقوق کا تعین فرماتے ہوئے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ
عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ (سورۃ بقرہ: ٢٢٨)

ترجمہ: اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق۔
اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے۔

لیکن یہ درجہ محض گھر کا انتظام ایک زیادہ باہمت، حوصلہ مند اور قوی شخصیت کے سپرد کرنے کے لیے ہے، عورتوں پر ظلم روا رکھنے کے لیے نہیں۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے خواتین کا شرف بحال کیا۔ اور مردوں کو ان پر حکومت کا اختیار دینے کی بجائے ان کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کی اور تلقین کی کہ بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ نبی کریمؐ نے بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کو خیر و بھلائی کا معیار ٹھہرایا۔ ارشاد فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ

ترجمہ: تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہے۔

ایک بار ایک صحابیؓ نے نبی اکرمؐ سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! بیوی کا اپنے شوہر پر کیا حق ہے؟ "آپ نے ارشاد فرمایا۔ "جو خود کھائے، اسے کھلائے۔ جیسا خود پہنے، ویسا اسے پہنائے۔ نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ نہ اسے برا بھلا کہے۔" آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کو بیویوں کے حقوق کا اتنا خیال تھا کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں ان سے حسنِ سلوک کی تلقین فرمائی۔ دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے نیک بیویوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (سورۃ النساء ۳۴)

ترجمہ: پس جو عورتیں نیک ہیں، فرمانبردار ہیں، نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے۔

جہاں مرد کو منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے بیوی بچوں کی کفالت، اور حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی، وہاں عورتوں کو پابند کیا گیا کہ وہ مردوں کی وفادار اور اطاعت گزار بن کر رہیں۔ ایک مسلمان بیوی کے لیے شوہر کی جو حیثیت ہوتی ہے اس کا اندازہ نبی کریمؐ کے اس ارشادِ گرامی سے ہوتا ہے۔ "اگر میں خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدے کا حکم دیتا تو بیوی سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔" شوہر کو بھی نصیحت کی گئی ہے کہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بیوی پر سختی نہ کرے۔ بلکہ اگر اس میں کچھ خامیاں بھی پائی جاتی ہوں تو درگزر کرے اور اس کی خوبیوں کی قدر کرے۔ اس بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى
أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○

(سورۃ النساء ۱۹)

ترجمہ: اور گزران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح۔ پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں، تو شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبی۔

اس بات کی تصریح نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی ایک حدیث مبارک سے ہوتی ہے جس میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا "اپنی بیویوں میں کوئی برائی دیکھ کر ان سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤ، اگر تم غور کروگے تو تمھیں ان میں کوئی اچھائی بھی ضرور نظر آجائے گی"۔

رشتہ داروں کے حقوق والدین اور اولاد اور شریکِ حیات (بیوی) کے حقوق کے بعد، اسلام رشتے داروں کے حقوق پر زور دیتا ہے۔ کیوں کہ معاشرتی زندگی میں انسان کا واسطہ اہلِ خانہ کے بعد سب سے زیادہ ان ہی سے پڑتا ہے۔ اگر خاندان کے افراد ایک دوسرے کے حقوق اچھے طریقے سے ادا کرتے رہیں، تو پورے خاندان میں محبت اور اپنائیت کی فضا قائم ہوگی اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو نفرت اور دوری پیدا ہوجائے گی اور آئے دن کے جھگڑوں سے خاندان کا سکون برباد ہوکر رہ جائے گا۔ اور پورا معاشرہ امن سے محروم ہوجائے گا۔ قرآن اور حدیث دونوں میں صلۂ رحمی یعنی رشتہ داروں سے حسن سلوک کی بار بار تلقین کی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (سورۃ الاسراء، ۲۶)

ترجمہ: رشتہ دار کو اس کا حق دو۔

نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ

ترجمہ: رشتہ داروں سے تعلق توڑنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ضرورت مند رشتے داروں کی ضروریات کا خیال رکھیں، تاکہ انھیں غیروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ تلقین کی گئی ہے کہ جو کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرو، اس میں ترجیح اپنے رشتے داروں کو دو اور پھر ان کے ساتھ جو سلوک کرو اس پر انھیں طعنے دے کر اپنے اجر و ثواب کو برباد نہ کرو۔ انھیں احساسِ تنہائی اور احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونے دو۔ ان کی شادی غمی میں شریک ہو۔ رشتے داروں کے ذریعے امداد کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح نہیں

ہوتی اور مقصد پورا ہوجاتا ہے، جب کہ غیروں سے مدد طلب کرنے میں اپنی ہی نہیں خاندان کی عزت بھی گھٹتی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص خدا اور رسول صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّم کی ہدایت کے مطابق اپنے رشتے داروں کے حقوق کا خیال رکھے تو معاشرہ بہت سی خرابیوں سے محفوظ رہے گا۔

اساتذہ کے حقوق اسلام نے جہاں مسلمانوں پر حصولِ علم کو فرض قرار دیا وہاں استاد کو بھی ایک باعزت مقام عطا کیا تاکہ اس کی وجاہت سے علم کا وقار بڑھے اور علم سے انسانیت کا۔ استاد کا یہ اعزاز کیا کم ہے کہ اسے اس پیشے کی وجہ سے نبی کریم صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔ جیسا کہ ارشاد رسول صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم ہے:

إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

ترجمہ: مجھے تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

استاد علم دے کر نئی نسل کی صحیح نشو و نما اور اس کے فکر و نظر کی اصلاح کرتے ہیں۔ نئی نسل ان ہی کے فراہم کردہ سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ استاد کے اعزاز و احترام کے بارے میں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا: "تیرے تین باپ ہیں۔ ایک وہ جو تجھے عدم سے وجود میں لایا، دوسرا وہ جس نے تجھے اپنی بیٹی دی۔ تیسرا وہ جس نے تجھے علم کی دولت سے مالا مال کیا۔"

معلم کی حیثیت علم کی بارش کی سی ہوتی ہے۔ اور طلبہ کی حیثیت زمین کی۔ جو زمین بارش کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ بارش کے فیض سے سرسبز و شاداب ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جو شاگرد اپنے استادوں کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتا ہے وہ علم کے ثمرات سے مستفید ہوتا ہے۔ یہ حوصلہ اور ظرف بھی، والدین کے علاوہ صرف استاد ہی کا ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاگرد کو خود سے آگے بڑھتے دیکھ کر حسد کرنے کی بجائے خوش ہوتا ہے، کیوں کہ حقیقت میں وہ اپنے طلبہ کی کامیابیوں کو اپنی ہی کامیابیاں سمجھتا ہے۔ مسلمانوں میں استاد کی احسان شناسی اور احترام کا اندازہ کچھ اس رواج سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ

شاگرد استاد کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنا لیتے تھے اور اس طرح لائق شاگردوں کے ذریعے استاد کا نام زندہ رہتا تھا۔

ہمسایوں کے حقوق انسان کو روزمرہ کی زندگی میں اپنے ہمسایوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی تکلیف یا بیماری کے وقت پڑوسی ہی وہ شخص ہوتا ہے جس کی مدد سب سے پہلے اور بآسانی دستیاب ہوتی ہے۔ جب کہ عزیز و اقارب تو اطلاع ملنے پر بہت دیر سے پہنچتے ہیں۔ مسجد میں نماز کی ادائگی کے وقت بھی پڑوسی سے روزانہ ملاقات ہوتی ہے۔ پڑوسی اور اس کے اہل و عیال کے اخلاق و کردار سے خود ہمارے گھر والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اگر پڑوسی بُرا ہو تو اس سے انسان کا ناک میں دم آجاتا ہے۔ اسلام نے پڑوسی کے حقوق پر بڑا زور دیا ہے اور پڑوسیوں کی تین قسمیں الگ الگ بیان کرکے ان سب سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ

(سورۃ النساء: ۳۶)

یعنی

(۱) وہ پڑوسی جو رشتے دار بھی ہو۔
(۲) وہ پڑوسی جو ہم مذہب یا رشتے دار نہ ہو۔
(۳) عارضی پڑوسی مثلاً ہم پیشہ، ہم جماعت، شریکِ سفر یا ایک ہی جگہ ملازمت یا کاروبار کرنے والے۔

ہمسایوں سے حسن سلوک کی نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے بہت تاکید فرمائی ہے۔ چند ارشادات درجِ ذیل ہیں:

(الف) وہ شخص مؤمن نہیں جو اپنے ہمسائے کی بھوک سے بے نیاز ہو کر شکم سیر ہو۔
(ب) تم میں سے افضل شخص وہ ہے جو اپنے ہمسائے کے حق میں بہتر ہے۔
(ج) اگر پڑوسی کو مدد کی ضرورت پڑے، تو اس کی مدد کرو۔ قرض مانگے تو اسے قرض دو۔ محتاج ہو جائے تو اس کی مالی امداد کرو۔ بیمار پڑ جائے تو عیادت کرو۔

اور مر جائے تو جنازے کے ساتھ قبرستان جاؤ۔ اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرو۔ اگر اسے کوئی اعزاز حاصل ہو تو اسے مبارک باد دو۔ اگر مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اس سے ہمدردی کرو۔ بغیر اجازت اپنی دیوار اتنی اونچی نہ کرو کہ اس کے لیے روشنی اور ہوا رک جائے۔ کوئی میوہ یا سوغات وغیرہ لاؤ تو اسے بھی بھیجو۔

(د) حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں اتنی شدت سے تاکید فرماتے تھے کہ ہم یہ سوچنے لگے کہ شاید میراث میں بھی پڑوسیوں کا حصہ رکھ دیا جائے گا۔

(ہ) ایک بار آپؐ کی محفل میں ایک عورت کا ذکر آیا کہ وہ بڑی عبادت گزار اور پرہیزگار ہے۔ دن میں روزے رکھتی ہے۔ اور رات کو تہجد ادا کرتی ہے۔ لیکن پڑوسیوں کو تنگ کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا "وہ دوزخی ہے" اور ایک دوسری عورت کے بارے میں عرض کیا گیا کہ وہ صرف فرائض (عبادات) ادا کرتی ہے۔ لیکن ہمسایوں کے حقوق کا خیال رکھتی ہے حضورؐ نے فرمایا۔ "وہ جنتی ہے۔"

(و) حضورؐ نے تین مرتبہ قسم کھا کر فرمایا کہ وہ شخص کامل مومن نہیں جس کی شرارتوں اور اذیتوں سے اس کے پڑوسی امن میں نہ ہوں۔

غیر مسلموں کے حقوق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس بات کی صراحت فرما دی ہے کہ کافر اور مشرک ہرگز ہرگز مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے سے شہری حقوق عطا کرتا ہے اور مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ ان سے شفقت آمیز برتاؤ کریں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ۗ
هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ

(سورۃ المائدۃ: ۸)

ترجمہ: اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات

زیادہ نزدیک ہے تقویٰ ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار غیر مسلموں سے ویسا ہی برتاؤ کریں جیسا ایک ڈاکٹر مریض سے کرتا ہے۔ اسی حسنِ سلوک سے مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے دل جیتے۔

معاشرتی ذمّے داریاں

اسلام انسانی معاشرے کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے اخلاقِ حسنہ کو بڑی اہمیت دی ہے اور مسلمانوں کے لیے اخلاقی قدروں کی پاسداری کو مذہبی فریضہ قرار دیا۔ اس سلسلے میں چند محاسنِ اخلاق کا ذکر کیا جاتا ہے:

دیانت داری معاشی اور معاشرتی تعلقات کی استواری کے لیے دیانت ایک بنیادی شرط ہے۔ جس معاشرے سے دیانت داری ختم ہو جائے وہاں کاروباری معاملات سے لے کر گھریلو تعلقات تک ہر جگہ ناقابلِ اصلاح بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اسلام اپنے نام لیواؤں کو ان تمام نقصانات سے بچانے کے لیے دیانت داری کی تلقین کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا ۙ

(سورۃ النساء: ۵۸)

ترجمہ: بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو۔

نیز جہاں دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کرنے والوں کی دیگر صفات بتائی گئی ہیں وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ ۙ

(سورۃ المؤمنون: ۸)

ترجمہ: اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی نگہبانی کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ آپ صلی اللہ

عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے قبل بھی عرب کے بد دیانت معاشرے میں "اَلْاَمِیْن" یعنی دیانت دار کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے احساسِ دیانت کا یہ عالم تھا کہ مدینے ہجرت کرتے وقت بھی ان لوگوں کی امانتوں کی ادائگی کا اہتمام فرمایا جو آپؐ کے قتل کے در پے تھے۔ اسلام نے دیانت کے مفہوم کو محض تجارتی کاروبار تک محدود نہیں رکھا، بلکہ وسعت دے کر جملہ حقوق العباد کی ادائگی کو دیانت کے دائرے میں شامل کر دیا۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: "محفل میں کی جانے والی باتیں بھی امانت ہیں۔" یعنی ایک جگہ کوئی بات سن کر دوسری جگہ جا سنانا بھی بد دیانتی میں داخل ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی امانتیں سمجھیں اور ان سب کو اس احساس کے ساتھ استعمال کریں کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کو ان کا حساب دینا ہے۔ دیانت کی اس تعریف کے پیشِ نظر ناممکن ہے کہ کوئی شخص مسلمان بھی ہو اور بد دیانت بھی۔ اسی لیے حضور اکرمؐ نے فرمایا:

"جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔"

ایفائے عہد انسانوں کے باہمی تعلقات میں ایفائے عہد یعنی وعدہ پورا کرنے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ہمارے اکثر معاملات کی بنیاد وعدوں پر ہوتی ہے۔ وہ پورے ہوتے رہیں تو معاملات ٹھیک رہتے ہیں۔ اگر ان کی خلاف ورزی شروع ہو جائے تو سارے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ اسی بگاڑ سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اسلام ایفائے عہد کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (سورۃ الاسراء: ۳۴)

ترجمہ: اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔

انسان کے تمام وعدوں میں اہم ترین عہد وہ ہے، جو اس نے یوم ازل بندگی کے معاملے میں اپنے خالق سے کیا تھا۔ قرآنِ عظیم نے اس کی یاد دہانی اس انداز سے کرائی ہے:

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ

تَذَكَّرُوْنَ ۝ (سورۃ الانعام : ۱۵۲)

ترجمہ: اور اللہ کا عہد پورا کرو تم کو یہ حکم کر دیا ہے۔ تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

ایک اور مقام پر باہمی معاہدوں اور اجتماعی رشتوں کی پاسداری کا لحاظ رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی:

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝
وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

(سورۃ الرعد : ۲۰ ، ۲۱)

ترجمہ: وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو اور

وہ لوگ جو ملاتے ہیں جن کو اللہ نے فرمایا ملانا۔

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے سخت حالات میں بھی عہد کی پابندی فرمائی۔ مثلاً جب صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابو جَندَل ؓ زنجیروں میں جکڑے ہوئے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور انھوں نے اپنے جسم کے داغ دکھائے کہ اہل مکّہ نے انھیں مسلمان ہو جانے پر کتنی اذیت دی ہے، اور درخواست کی کہ انھیں مدینہ ساتھ لے جایا جائے۔ تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے اس شفقت کے باوصف، جو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کو مسلمانوں سے تھی، انھیں اپنے ہمراہ مدینے لے جانے سے محض اس لیے انکار کر دیا کہ قریش سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ مکّہ سے بھاگ کر آنے والے مسلمانوں کو مدینے سے لوٹا دیا جائے گا۔ حضرت ابو جندل ؓ کی دردناک حالت تمام صحابہ کرام ؓ کے لیے بے قراری کا باعث تھی لیکن صلح نامہ حدیبیہ کی پاس داری کے پیشِ نظر سب نے صبر و تحمل سے کام لیا۔

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم اپنے خطبوں میں اکثر یہ بات فرماتے تھے:

لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: جسے وعدے کا پاس نہیں اس میں دین نہیں۔

ہمارے لین دین کے جملہ معاملات اور باہمی حقوق ایفائے عہد ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس لیے دین داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سب کی پاسداری کریں۔

سچائی سچائی ایک ایسی عالمگیر حقیقت ہے جسے تسلیم کیے بغیر انسان سکھ چین کا سانس نہیں لے سکتا۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے اس بات کو نہایت جامعیت کے ساتھ یوں ارشاد فرمایا:

اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُهْلِكُ

ترجمہ: سچائی انسان کو ہر آفت سے محفوظ رکھتی ہے اور جھوٹ سے ہلاک کر ڈالتا ہے۔

قرآن کریم میں باری تعالیٰ نے اپنے صادق القول ہونے کا ذکر فرمایا۔ [illegible]

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا (سورۃ النساء: ۸۷)

ترجمہ: اور اللہ سے سچی کس کی بات ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں انبیاءؑ کی اس صفت کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ وہ راست گفتار تھے۔ سچائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ تمام انبیاءؑ نے وہیں سے سچائی حاصل کی اور دنیا میں پھیلائی۔ اس سچائی سے انکار کرنے والا زندگی کے ہر معاملے میں جھوٹ اور باطل کی پیروی کرتا ہے۔ اور ہلاک ہو کر رہتا ہے۔ اردو میں ہم سچ کا لفظ محض گفتگو کے تعلق سے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے مفہوم میں قول کے ساتھ عمل اور خیال تک کی سچائی شامل ہے۔ یعنی صادق وہ ہے جو نہ صرف زبان ہی سے سچ بولے بلکہ اس کے فکر وعمل میں بھی سچائی رچی بسی ہو۔

عدل وانصاف عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا جائز حق بآسانی مل جائے۔ نظامِ عدل کی موجودگی میں معاشرے کے امور بخیر وخوبی سرانجام پاتے ہیں۔ اور بے انصافی کی وجہ سے معاشرے کا ہر شعبہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعثت نبویؐ سے قبل دنیا عدل وانصاف کے تصور سے خالی ہو چکی تھی۔ طاقتور ظلم وستم کو اپنا حق سمجھنے لگے تھے اور کمزور اپنی مظلومیت کو مقدر سمجھ کر برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ دینِ اسلام کے طفیل ظلم وستم کا یہ کاروبار بند ہوا اور دنیا عدل وانصاف کے اس اعلیٰ معیار سے

آشنا ہوئی جس نے رنگ و نسل اور قوم و وطن کے امتیازات کو مٹا کر رکھ دیا۔ ناانصافی کی بنا پر انسانوں کے مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان نفرت کی جو دیوار کھڑی ہو گئی تھی، اسلام نے اسے گرا کر انسان کو انسان کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا۔ اس طرح لوگوں کے درمیان اُنس و محبت کا وہ رشتہ استوار ہوا جو انسانیت کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عدل و انصاف کے معاملے میں بلا امتیاز تمام نسلِ انسانی کے درمیان مساوات قائم کرنے کا حکم دیا۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ
بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا
تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (سورۃ المائدہ ۵: ۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔

رنگ و نسل کی طرح اسلام کے تصورِ عدل میں کسی کے اعلیٰ منصب اور مرتبے کو کوئی اہمیت نہیں۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم کے وہ ارشادات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں جو آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے قبیلہ بنی مخزوم کی فاطمہ نامی خاتون کی چوری سے متعلق سزا کی معافی کی سفارش سن کر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے فرمایا:

"تم سے پہلے قومیں اسی سبب سے برباد ہوئیں کہ ان کے چھوٹوں کو سزا دی جاتی تھی اور بڑوں کو معاف کر دیا جاتا تھا۔ خدا کی قسم! اگر فاطمہؓ بنت محمد صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

اسلامی حکومت کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اپنے باشندوں کو ہمیشہ بے لوث انصاف فراہم کیا ہے اور حقیقت میں اسلامی حکومت کا اصل مقصد ہی

نظامِ عدل کا قیام ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلطانِ عادل کو خدا کا سایہ قرار دیا۔

احترام قانون جس طرح قدرت کا نظام چند فطری قوانین کا پابند ہے، اسی طرح معاشرے کا قیام و دوام، معاشرتی، اخلاقی اور دینی احکام و قوانین پر موقوف ہے۔ یوں تو دنیا کا کم عقل سے کم عقل انسان بھی قانون کی ضرورت، اس کی پابندی اور اہمیت کا اعتراف کرے گا، لیکن کم لوگ ایسے ہیں جو عملاً قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔ عصرِ حاضر میں دو افراد کے باہمی معاملات سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک لوگ ضابطے اور قانون کی پابندی سے گریزاں ہیں۔ اور لاقانونیت کے اس رجحان نے دنیا کا امن و سکون غارت کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان قانون کی افادیت کا قائل ہونے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کیوں کرتا ہے؟ اس کی دو اہم وجوہ ہیں:

(۱) ایک خود غرضی اور مفاد پرستی۔

(۲) دوسرے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنا۔

اسلام ان دونوں وجوہ کا خوبی سے تدارک کر کے مسلمانوں کو قانون کا پابند بناتا ہے۔ ایک طرف وہ انھیں خدا پرستی اور ایثار و سخاوت کا درس دیتا ہے، دوسری طرف ان میں آخرت کی جواب دہی کا احساس و شعور پیدا کرتا ہے۔ اسلام انھیں احساس دلاتا ہے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ یا دھوکے فریب سے دنیا میں قانون کی خلاف ورزی کی سزا سے بچ بھی گئے تو آخرت میں انھیں خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ آخرت میں جواب دہی کا یہی احساس اسلامی معاشرے کے گناہ میں ملوث ہو جانے والے افراد کو از خود عدالت میں جانے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اصرار کرتے ہیں کہ انھیں دنیا ہی میں سزا دے کر پاک کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائیں۔

لوگوں کے دلوں میں قانون کے احترام کا سچا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود حکمران طبقہ بھی قانون کی پاسبانی کرے اور اپنے اثر و رسوخ کو قانون کی زد سے

بچنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ آج دنیا کا شاید ہی کوئی دستور یا آئین ایسا ہو، جس میں حکمراں طبقے کو مخصوص مراعات مہیا نہ کی گئی ہوں اور قانون میں آقا و غلام اور شاہ و گدا کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ گم ہو گئی اور ایک یہودی کے پاس ملی۔ خود خلیفۂ وقت ہونے کے باوصف آپؓ اسے قاضی کی عدالت میں لے گئے اور جب قاضی نے آپؓ کے بیٹے اور غلام دونوں کی گواہی ان سے قریبی تعلق کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپؓ اپنے دعوے سے دستبردار ہو گئے۔ احترامِ قانون کی اس مثال نے یہودی کو اتنا متاثر کیا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

کسبِ حلال

کسبِ حلال کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ

(سورۃ المؤمنون: ۵۱)

ترجمہ: اے رسولو! کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا۔

اسی طرح تمام انسانوں کو تلقین فرمائی گئی:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۫

(سورۃ البقرہ: ۱۶۸)

ترجمہ: اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ۔

مزید براں مسلمانوں کو خصوصی تاکید کی گئی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

(سورۃ البقرہ: ۱۷۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو۔

اسلام میں عبادات اور معاملات کے ضمن میں کسبِ حلال کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے عبادات کی مقبولیت کے لیے کسبِ حلال کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

(سورۃ البقرہ : ۱۸۸)

ترجمہ : اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق۔

جس معاشرے میں ناجائز ذرائع آمدنی یعنی ناانصافی، بددیانتی۔ رشوت ستانی، سود خوری، چوری، ڈاکہ زنی، ذخیرہ اندوزی، فریب دہی اور سٹے بازی کا رواج عام ہو جائے تو اس معاشرے کی کشتی تباہی کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور بربادی اس معاشرے کا مقدر بن جاتی ہے۔ اسلام ہر معاملے میں کسبِ معاش کے ان تمام غلط طریقوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور ناجائز ذرائع کے اختیار کرنے والوں کو جہنم کی خبر دیتا ہے۔ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا ارشادِ مبارک ہے۔ "حرام رزق پر پلنے والے جسم کو جہنم ہی کا ایندھن بننا چاہیے۔" جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر یقین ہوگا وہ کبھی جائز وسائل کو چھوڑ کر ناجائز ذرائع کا رخ نہیں کرے گا۔ خواہ ان میں کتنی ہی دلکشی کیوں نہ ہو۔ البتہ جو شخص اس شیطانی وسوسے میں مبتلا ہو کر میں ناجائز ذرائع سے اپنے مقدر سے زیادہ کما سکتا ہوں۔ وہی حرام طریقوں کا سہارا لے گا۔ شیطان کے اس حربے کو ناکام بنانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ معیار زندگی کا ڈھونگ رچانے کی بجائے سادگی۔ کفایت شعاری، میانہ روی اور قناعت پسندی کے اصولوں پر کاربند رہا جائے۔

ایثار دنیا پرستی اگر انسان کو خود غرضی اور مفاد پرستی سکھاتی ہے تو دین داری اس میں جذبۂ ایثار پیدا کرتی ہے۔ وہ خود تکلیف اٹھا کر مخلوقِ الٰہی کو راحت و آرام پہنچاتا ہے۔ اس کا عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت پائے گا اور اخروی نعمتوں کے حصول کا سبب بنے گا۔

دیگر محاسن اخلاق کی طرح نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم ایثار و سخاوت کا بہترین نمونہ تھے اور سربراہِ مملکت ہوتے ہوئے بھی انتہائی سادگی اور جفاکشی کی زندگی گزارتے تھے۔ خانۂ مبارک میں ہفتوں چولھا نہیں جلتا تھا لیکن آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے گھر سے کوئی سائل محروم نہیں لوٹا۔ اپنے پاس کچھ موجود نہ ہوتا تو قرض لے کر

حاجت مند کی حاجت پوری کرتے۔ ایک بار آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّم نے جانور ذبح فرمایا، اور گوشت تقسیم کی غرض سے گھر بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد گھر میں آکر دریافت فرمایا۔ کتنا تقسیم ہو گیا ہے اور کتنا بچا۔ عرض کیا گیا کہ عمدہ قسم کا گوشت تقسیم ہو گیا اور خراب قسم کا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: "اور جو تقسیم ہو گیا ہے وہ رہ گیا اور جو باقی بچا ہے، حقیقت میں وہ چلا گیا ہے۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم بھی جذبۂ ایثار سے سرشار تھے اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی حاجت کو ترجیح دیتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ رومیوں کے مقابلے میں جانے والی فوج کے ساز و سامان کے لیے مسلمانوں سے مالی اعانت طلب کی گئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ گھر کا سارا سامان لے آئے۔ ایک دفعہ حضرت عثمان رضؓ نے قحط کے زمانے میں باہر سے آنے والا غلہ دوگنے، چوگنے منافع کی پیش کش کرتے ہوئے خریدا اور بلا معاوضہ تقسیم کر دیا۔

صحابہ کرام رضؓ کے ایثار کے سلسلے میں ایک واقعہ بڑا اثر انگیز ہے۔ ایک بار کوئی بھوکا پیاسا شخص حضور پُرنور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّم کے پاس حاضر ہوا۔ رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّم کے دولت کدے پر پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ حسب دستور ایک انصاری صحابی رضؓ آپ کے مہمان کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ گھر پہنچ کر بیوی سے معلوم ہوا کہ کھانا صرف بچوں کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے کہا بچوں کو بہلا کر فاقے کی حالت میں سلا دو اور کھانا شروع کرتے وقت کسی بہانے چراغ بجھ دینا تاکہ مہمان کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ ہم کھانے میں شریک نہیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ مہمان نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور انصاری کا یہ پورا گھرانا بھوکا سویا۔ صبح جب یہ صحابی رضؓ حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو حضور ؐ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ جل شانہٗ تمھارے رات کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔ ایسے ہی ایثار پیشہ لوگوں کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ

(سورۃ الحشر: ۹)

ترجمہ : اور وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ خود فاقے ہی سے کیوں نہ ہوں۔

ہجرت کے موقع پر انصارؓ مدینہ نے مہاجرینؓ مکہ کے ساتھ حسنِ سلوک کے سلسلے میں جس ایثار و قربانی کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔

اخلاقی رذائل جس طرح اخلاقِ حسنہ کی ایک طویل فہرست ہے، جن کو اپنا کر آدمی دنی اور آخرت میں سرخرو ہو سکتا ہے اسی طرح کچھ ایسے اخلاقِ رذیلہ ہیں جن کو اختیار کر کے انسان حیوانی درجے میں جا گرتا ہے۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جات ہے۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اخلاقِ فاضلہ سے آراستہ ہوں اور اخلاقِ رذیلہ سے بچیں جو انسان کی شخصیت کو داغ دار کر دیتے ہیں اور اسے ہر قسم کی نیکی اور بھلائی سے محروم کر دیتے ہیں۔ چند اخلاقِ رذیلہ کا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

جھوٹ جھوٹ نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک برائی ہے، بلکہ بہت سی اخلاقی برائیوں کا سبب بھی بنتا ہے۔ اسلام میں جھوٹ بولنے کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔ جھوٹ بولنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی طرح ارشاد باری ہے کہ جھوٹے آدمی کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی :

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ (سورۃ الزمر، ۳)

ترجمہ : البتہ اللہ راہ نہیں دیتا اس کو جو جھوٹا اور حق نہ ماننے والا ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا : "مؤمن کی فطرت میں ہر خصلت ہو سکتی ہے، مگر خیانت اور جھوٹ کی خصلت مؤمن میں ہرگز ممکن نہیں"۔

(رواہ البیہقی عن سعد بن ابی وقاص)

مسند احمد میں عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے :

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کسی شخص نے دریافت کیا۔ "یارسول اللہ! جنت میں لے جانے والا کون سا عمل ہے؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ "سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے۔ اس سے اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور ایمان میں یہ اضافہ جنت میں داخلے کا سبب بنتا ہے۔" اس شخص نے دریافت کیا: "یا رسول اللہ۔ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟" فرمایا: "جھوٹ بولنا۔ جب بندہ جھوٹ بولے گا۔ تو گناہ کے کام کرے گا۔ جب گناہ کے کام کرے گا تو گویا کفر کرے گا۔ اور یہ کفر اسے جہنم میں لے جائے گا۔" جھوٹ کا تعلق محض زبان سے نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ناپسندیدہ اعمال بھی جھوٹ کی تعریف میں آتے ہیں۔ مثلاً غلط طریقے سے کسی کا مال ہتھیانا، کم تولنا، غرور کرنا، منافقت سے کام لینا وغیرہ۔ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے نمود و نمائش کو بھی جھوٹ کی ایک قسم قرار دیا۔ جھوٹ کے نتیجے میں باہمی اعتماد نہیں رہتا۔ انسان کی ساکھ ختم ہو جاتی ہے اور معاشرتی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جھوٹ کی ہر قسم سے پرہیز کریں۔

غیبت اخلاقی بیماریوں میں غیبت جس قدر بری بیماری ہے بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں اسی قدر عام ہے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو اس بیماری سے محفوظ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس گناہ سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ
لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ (سورۃ الحجرات: ۱۲)

ترجمہ: اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو، بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو کہ کھائے
گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو، تو گھن آتا ہے تم کو اس سے۔

غیبت کے لیے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کی تمثیل انتہائی بلیغ ہے۔ کیونکہ جس شخص کی غیبت کی جاتی ہے، وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اس طرح غیبت سے باہمی نفرت کو ہوا ملتی ہے اور دشمنی کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ غیبت کے مرض میں مبتلا شخص خود کو عموماً عیبوں سے پاک تصور کرنے لگتا ہے اور جس کی غیبت کی جائے وہ اپنے عیب تشہیر ہو جانے کے باعث ورڈھیٹ ہو جاتا ہے۔ غرض غیبت ہر لحاظ سے معاشرتی سکون کو برباد کرتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے معراج کے وقت

بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں نے ایک گروہ کو دیکھا۔ اُن کے ناخن تانبے کے تھے۔ اور وہ لوگ اس سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے دریافت کیا "یہ کون لوگ ہیں"؟ فرمایا "یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزت و آبرو بگاڑتے ہیں (یعنی غیبت کرتے ہیں)"

شریعت اسلامی میں غیبت صرف دو صورتوں میں جائز قرار دی گئی ہے ایک مظلوم کی ظالم کے خلاف فریاد کی شکل میں اور دوسرے لوگوں کو کسی فریب کار کی فریب کاری سے آگاہ کرنے کے لیے۔ بعض علماء نے نقل اتارنے اور تحقیر آمیز اشارات کرنے کو بھی غیبت میں شمار کیا ہے۔

غیبت و اتّہام کا فرق غیبت اور اتہام میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ غیبت سے مراد کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی ایسی برائی بیان کرنا ہے جو اس میں موجود ہے، جب کہ تہمت لگانے سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کا ایسا عیب بیان کیا جائے جو اس میں موجود نہ ہو اور اس کے دامنِ عفت کو بلا وجہ داغدار بنایا جائے۔

منافقت علمائے اسلام نے منافق کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ ایک وہ منافق جو دل سے اسلام کی صداقت و حقانیت کا قائل نہیں، لیکن کسی مصلحت یا شرارت کی بنا پر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں اور اسلام دونوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اسے اعتقادی منافق کہتے ہیں۔ دوسرا وہ منافق ہے جو اگرچہ خلوص نیت سے اسلام قبول کرتا ہے لیکن بعض بشری کمزوریوں کی وجہ سے اسلام کے عملی احکام پر چلنے میں تساہل یا کوتاہی کرتا ہے اسے عملی منافق کہتے ہیں۔ پہلی قسم کا منافق کافروں سے بدتر ہے جب کہ دوسری قسم کا منافق صاحب ایمان ضرور ہے لیکن اس کی تعلیم و تربیت ابھی ناقص ہے جو کسی معلم و مربی کے فیضانِ صحبت سے اسے حاصل ہو سکتی ہے۔

مسلمانوں کے خلاف منافقوں کی سب سے خطرناک چال یہ ہوتی ہے کہ وہ دینداری کے پردے میں مسلمانوں کو باہم لڑا دیں۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے مدینے میں مسجد نبویؐ کے مقابل مسجد ضرار تعمیر کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

نے اس مسجد کو مسمار کر کے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ
عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (سورۃ التحریم: ۹)

ترجمہ: اے نبی! لڑائی کر منکروں سے اور دغابازوں سے اور سختی کر ان پر اور ان کا گھر دوزخ ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے منافق کی پہچان بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں:

(۱) جب بولے تو جھوٹ بولے۔

(۲) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔

(۳) جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے چاہے وہ نماز اور روزے کا پابند ہو وہ منافق ہی ہے۔ قرآن مجید میں ان منافقوں کے انجام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ دوزخ کے سب سے نچلے اور تکلیف دہ حصے میں رکھے جائیں گے۔

تکبر

تکبر کے معنی خود کو بڑا اور برتر سمجھنے اور ظاہر کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے شیطان نے تکبر کیا اور کہا میں آدمؑ سے افضل ہوں۔ اس لیے ان کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالےٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا:

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ
اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ (سورۃ الاعراف: ۱۳)

ترجمہ: تو اتر یہاں سے تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں۔ پس باہر نکل تو ذلیل ہے۔

وہ دن اور آج کا دن، غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا چلا آیا ہے اور فرمانِ الٰہی کے مطابق آخرت میں بھی متکبر انسانوں کا ٹھکانا جہنم ہو گا:

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (سورۃ الزمر: ۶۰)

ترجمہ: کیا نہیں دوزخ میں ٹھکانہ غرور کرنے والوں کا۔

تکبر کی مذمت فرماتے ہوئے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

”جس کے دل میں رائی برابر بھی غرور اور تکبر ہوگا وہ انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“

مغرور و متکبر انسان دوسروں کو حقیر سمجھ کر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور گناہوں پر بے باک ہو جاتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا کون دے سکتا ہے۔ اسی لیے وہ مُروّت، اخوت، ایثار اور اس قسم کی سبھی بھلائیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

حسد انسان دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے کسی بھائی کو اچھی حالت میں دیکھیں تو خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ لیکن حسد وہ بری خصلت ہے کہ جو کسی کو خوش حال اور پُرسکون دیکھ کر انسان کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ اپنے بھائی کی خوشحالی دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے دل ہی دل میں جلتا اور کُڑھتا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ دوسروں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا، خود اپنے لیے پریشانی مول لے لیتا ہے یوں تو حسد ایک اخلاقی بیماری ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں انسان کئی دوسری اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ دوسروں کو بہتر حالت میں دیکھنے کا روادار نہیں ہوتا تو اپنے بہت سے عزیزوں سے ترکِ تعلق کر لیتا ہے جو ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ اسی طرح جس شخص کی طبیعت میں حسد پیدا ہو جائے وہ کبھی قانع نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنے سے برتر کو دیکھ کر اپنی حالتِ زار پر کفِ افسوس ملتا رہتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اپنی حالت بہتر بنانے پر صَرف ہو سکتی ہیں، ہمیشہ دوسروں کی حالت کو بگاڑنے ہی کی فکر میں ضایع ہوتی رہتی ہیں۔ حاسد اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں خود ہی جلتا رہتا ہے۔ گو اسلام اپنے پیروکاروں کو باہمی محبت اور احسان کی تلقین کرتا ہے تاکہ معاشرتی اعتبار سے اجتماعی فلاح حاصل ہو سکے لیکن حاسد کے دل میں سوائے نفرت اور جلن کے کوئی شریفانہ جذبہ جگہ نہیں پا سکتا۔ اجتماعی فلاح کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے کے جملہ افراد معزز اور خوش حال ہوں لیکن حاسد لوگوں کی نیک نامی اور خوش حالی کو ذلت و خواری میں بدلتے دیکھنا چاہتا ہے۔ پس ایک نہ ایک دن وہ

معاشرے کی نظروں میں ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ مسلمانوں کو ان تمام نقصانات سے بچانے کے لیے حضور نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے حسد سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔

ترجمہ: دیکھو! حسد سے بچو۔ کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو۔

اگر انسان حسد اور اس جیسے دوسرے اخلاقِ رذیلہ سے بچنا چاہتا ہے تو اسے رسولِ پاکؐ، صحابہؓ اور بزرگانِ دین کی سادگی و قناعت کی تاریخی مثالوں سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔ اور اس کے ساتھ اسے یہ بھی چاہیے کہ دولت و اقتدار سے پیدا ہونے والی برائیوں اور مفاسد پر نظر رکھے۔

سوالات

۱۔ ارکانِ اسلام سے کیا مراد ہے؟ فرد کی تعمیرِ سیرت اور معاشرے کی تشکیل میں نماز کیا کردار ادا کرتی ہے؟

۲۔ روزے کے مقاصد بیان کریں اور عملی زندگی پر اس کے اثرات تفصیل سے لکھیں۔

۳۔ "اسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔" اس موضوع پر مفصل اظہارِ خیال کریں۔

۴۔ حج کا فلسفہ کیا ہے؟ نیز اس کے انفرادی اور اجتماعی فوائد بیان کریں۔

۵۔ جہاد سے کیا مراد ہے؟ اس کی قسمیں اور فضائل بیان کریں۔

۶۔ اولاد کے حقوق و فرائض قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کریں۔

۷۔ اسلام نے عورت کو معاشرے میں کیا مقام دیا ہے؟ اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں بیان کریں۔

۸۔ مندرجہ ذیل کے حقوق و فرائض پر مختصر نوٹ لکھیں:

رشتہ دار۔ ہمسائے۔ اساتذہ۔ غیر مسلم۔

۹۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کن امور کی پابندی ضروری ہے؟

۱۰۔ اخلاقی رذائل سے کیا مراد ہے؟ ایسے پانچ رذائل کا ذکر کریں اور بتائیں کہ ان سے معاشرے میں کیسے بگاڑ پیدا ہوتا ہے؟

باب سوم

اُسوۂ رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ انھوں نے ایک مثالی انسان کی زندگی گزاری۔ دکھ سہے، خوشیاں دیکھیں۔ ناکامیاں برداشت کیں اور کامیابیاں حاصل کیں۔ جنگیں بھی لڑیں اور امن کی حالت میں بھی رہے۔ سفر کی زندگی بھی دیکھی اور گھر کی بھی اور تمام حالتوں میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے سے سرِ مو نہیں ہٹے اور اللہ کے احکامات کو بہترین طریقے سے بجالاتے رہے۔ اس طرح انھوں نے ہمیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات بجالانا اور اس کے بتائے ہوئے رستے پر چلنا ایک مسلمان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی زندگی قرآن مجید کی تشریح و تفسیر ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہے:

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ

ترجمہ: قرآن مجید ہی آپؐ کا اخلاق تھا۔

اس لیے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے میں دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ احزاب ۲۱)

ترجمہ: تم لوگوں کے لیے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

اسوۂ حسنہ کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں جو اس مختصر باب میں

نہیں سما سکتیں۔ البتہ ہم حضورؐ کے اخلاقِ مبارکہ میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

رحمۃٌ للعالمین اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

(سورۃ الانبیاء: ۱۰۷)

ترجمہ: ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپؐ نے دنیا کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا کر اس کے عذاب سے بچایا۔ ایک، اللہ کی عبادت اور اس سے محبت سکھائی۔ ایک ایسا نظامِ زندگی دیا جو انسانیت کو امن و سلامتی کی طرف لے جاتا ہے اور نوعِ انسان کے لیے سراسر رحمت ہے۔ اس طرح آپؐ تمام جہانوں کے لیے اللہ کی رحمت ثابت ہوئے۔

آپؐ خود بھی رحمت اور محبت کا پیکر ہیں۔ تمام عمر آپؐ مخلوقِ خدا سے لطف و کرم کے ساتھ پیش آتے رہے۔

امت پر شفقت و رحمت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے بارے میں فرمایا ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

(سورۃ التوبہ: ۱۲۸)

ترجمہ: تمھارے پاس اللہ کا ایک رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمھاری تکلیف اس پر گراں گزرتی ہے۔ تمھاری بھلائی کا خواہش مند رہتا ہے۔ اہلِ ایمان کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

آپؐ قرض داروں کا قرض ادا فرماتے، حاجت مندوں کی حاجت پوری کرتے، ناداروں اور مفلوک الحال لوگوں کی مدد کرتے۔ آپؐ نے عمر بھر اپنے دروازے سے کسی سائل کو محروم واپس نہیں لوٹایا۔ اپنے ساتھیوں کو تکلیف میں دیکھ کر بے قرار ہو جاتے

اور ان کی اعانت فرماتے۔ غم زدوں کی دلجوئی کرتے۔ آپؐ کو اپنے صحابہ کی تکلیف اتنی گراں گزرتی کہ انھیں دینی امور میں بھی دشواری میں ڈالنا پسند نہ فرماتے۔ آپ کا ارشاد ہے۔ "اگر امت پر دشواری نہ ہوتی تو میں انھیں ہر نماز کے لیے مسواک کرنے کا حکم دیتا۔" آپ اہل ایمان کے لیے بالخصوص سراپا رحمت ہیں۔

کافروں پر رحمت آپؐ کی رحمت صرف مؤمنین تک محدود نہ تھی، کافروں کے لیے بھی ہمیشہ رحمت رہے۔ گذشتہ امتوں پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے مختلف عذاب آتے رہے۔ لیکن رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی ذات بابرکات کی وجہ سے کفارِ مکہ تمام نافرمانیوں کے باوجود دنیا میں عذابِ عامہ سے محفوظ رہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (سورۃ الانفال: ۳۳)

ترجمہ: اور اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک آپؐ ان میں موجود ہیں۔

ایک دفعہ آپؐ کو کفار کی طرف سے سخت تکلیف پہنچی۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم ان کے لیے بد دعا کریں۔ آپؐ نے فرمایا: "میں لعنت کرنے والا نہیں۔ میں تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔" قبیلہ دوس نے سرکشی و نافرمانی کی تو آپؐ نے بد دعا کی جگہ یہ دعا دی:

اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَّائْتِ بِهِمْ

ترجمہ: "اے اللہ۔ قبیلہ دوس کو ہدایت دے اور ان کو دائرہ اسلام میں لا۔"

طائف میں جب کفار نے آپؐ کو پتھر مار مار کر زخمی کیا تو آپؐ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے:

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

ترجمہ: اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے۔ پس بیشک یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

عورتوں کے لیے رحمت عرب کے معاشرے میں عورت کی کوئی عزت تھی نہ مقام تھا۔ لڑکیوں کا وجود باعثِ شرم سمجھا جاتا تھا۔ حضورؐ نے انھیں عزت و احترام عطا کیا۔

ان کے حقوق اور فرائض متعین کیے اور انھیں ماں، بیٹی، بہن اور بیوی ہر حیثیت سے معاشرے میں صحیح مقام سے نوازا۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ

ترجمہ: جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ

ترجمہ: تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔

بچوں کے لیے رحمت نبیِّ محترمؐ بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور ان سے بے انتہا پیار کرتے۔ ایک دفعہ رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم حسنؓ بن علیؓ سے پیار کر رہے تھے، اقرع بن حابسؓ تمیمی بھی محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم میرے دس بچے ہیں۔ میں نے کبھی کسی کو اس طرح پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"جو رحم نہیں کرتا۔ اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"

یتیموں اور غلاموں کے لیے رحمت آپؐ یتیم بچوں پر بہت زیادہ مہربان تھے۔

آپؐ نے فرمایا:

اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ فِى الْجَنَّةِ هٰكَذَا

ترجمہ: میں اور یتیم کی نگہداشت کرنے والا جنت میں یوں ہوں گے (اور آپؐ نے دونوں انگلیاں ملالیں)

اسی طرح غلاموں کے متعلق آپؐ کا ارشاد ہے کہ "تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمھارا ماتحت بنایا ہے۔ تم جو خود کھاؤ، وہی انھیں بھی کھلاؤ اور جیسا خود پہنو ویسا ہی انھیں بھی پہناؤ۔ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام کا بوجھ نہ ڈالو۔"

اُخُوّت

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی تشریف آوری سے پہلے عرب معاشرے میں فتنہ و فساد اور جنگ و جدال روزمرہ کا معمول تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں لڑ پڑتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر قبیلوں میں لڑائیاں چھڑ جاتی تھیں اور پھر سالہا سال تک جاری رہتی تھیں۔ آپؐ نے اپنے کردار اور انقلابی تعلیم سے ان کا مزاج بدل دیا۔ دشمن دوست ہوگئے اور خون کے پیاسے بھائی بن گئے۔ اسی نعمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ

(سورۃ آلِ عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی۔ سو تم اس کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے۔

محبّت کا یہ جذبہ جو رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی صحبت میں پیدا ہوا کسی اور طریقے سے نہیں پیدا کیا جا سکتا تھا۔ نہ وعظ و نصیحت سے، اور نہ مال دولت سے۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ
اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(سورۃ الانفال: ۶۳)

ترجمہ: اور ان کے قلوب میں الفت پیدا کردی اور اگر آپ دنیا بھر کا مال خرچ کرتے تب بھی ان کے قلوب میں الفت پیدا نہ کرسکتے۔ لیکن اللہ ہی نے ان میں باہم الفت پیدا کردی۔ بے شک وہ زبردست حکمت والا ہے۔

جب رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے

گئے تو آپؐ نے مہاجرینِ مکہؓ و انصارِ مدینہؓ کے درمیان بھائی چارے کا رشتہ قائم کر دیا۔ ہر مہاجر کو کسی انصاری کا دینی بھائی بنایا اور اس طرح "مؤاخات" کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انصار نے اپنے مکانات، باغات اور کھیت آدھوں آدھ اپنے بھائیوں کو پیش کیے تاہم اکثر مہاجرین نے تجارت و محنت سے پیٹ پالنے کو ترجیح دی۔

مسلمانوں پر جب بھی کوئی تکلیف کا وقت آئے تو دوسرے مسلمانوں کو اس تکلیف میں جانی و مالی دونوں طریقوں سے شرکت کرنی چاہیے۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔

مسلمان جب بھی کسی تکلیف میں مبتلا ہوں تو دوسرے مسلمان بھائیوں کو رسولِ رحمتؐ کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کا ساتھ دینا چاہیے اور انھیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (سورۃ الحجرات : ۱۰)

ترجمہ: یقیناً تمام مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

رسولِ اکرمؐ ارشاد فرماتے ہیں:

اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ

ترجمہ: "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔"

مساوات

مساوات اسلامی معاشرے کی بنیاد ہے۔ جس کے بغیر کوئی معاشرہ نہ صالح رہ سکتا ہے نہ ترقی کر سکتا ہے۔ اونچ نیچ اور ذات پات کے امتیازات سے معاشرے میں ہزاروں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں اپنے قول و عمل سے مساوات کی بہترین تعلیم دی ہے۔

آپؐ کے نزدیک، امیر و غریب حاکم و محکوم، آقا و غلام سب برابر تھے۔ آپؐ نے ذات پات اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات مٹا دیے۔ حضرت سلمان فارسیؓ، صُہیب رومیؓ اور بلال حبشیؓ کی قدر و منزلت رسولؐ اللہ کی نگاہ میں قریش کے معززین سے کم نہ تھی۔ مساوات کا عملی مظاہرہ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے اپنی پھوپی زاد حضرت زینبؓ کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کر دادی۔ خود اپنے بیٹھنے کے لیے الگ جگہ مخصوص نہ کی۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان بے تکلفی سے بیٹھ جاتے۔ آپؐ کا لباس عام مسلمانوں کا لباس تھا۔ آپؐ کا حجرہ نہایت سادہ اور مختصر تھا اور آپؐ کی غذا سادہ تھی۔

مسجد قبا اور مسجد نبویؐ کی تعمیر میں آپؐ نے صحابہؓ کے ساتھ مل کر کام کیا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر اپنے ہاتھوں سے پتھر توڑے اور خندق کھودی اور کسی بھی موقع پر اپنے آپ کو دوسروں سے برتر نہیں سمجھا۔

خطبۂ حجۃ الوداع میں آپؐ نے ساری دنیا کے انسانوں کو مساوات کا پیغام دیتے ہوئے فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَّاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ
اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَّلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ
وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى

ترجمہ: اے لوگو! تم سب کا پروردگار ایک ہے اور تم سب کا باپ بھی ایک ہے۔ کوئی فضیلت نہیں عربی کو عجمی پر، نہ عجمی کو عربی پر، نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر سوائے تقوی کے۔

صبر و استقلال

صبر کے لغوی معنی روکنے اور برداشت کرنے کے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو خوف اور گھبراہٹ سے روکنا اور مصائب و شدائد کو برداشت کرنا۔ استقلال کے لغوی معنی استحکام اور مضبوطی کے ہیں۔ الغرض صبر و استقلال، دل کی مضبوطی، اخلاقی بلندی اور

ثابت قدمی کا نام ہے۔ قرآنِ مجید میں صبر کی بڑی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ۭ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

(سورۂ لقمان: ۱۷)

ترجمہ: اور جو مصیبت تجھے پیش آئے اسے برداشت کر۔ یہ بڑے عزم کی بات ہے۔

دوسری جگہ پر فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (سورۃ البقرہ: ۱۵۳)

ترجمہ: بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مصیبت اور پریشانی کے وقت اپنے بندوں کو صبر و رضا کی تاکید کی ہے۔ ور چونکہ انسان کی جان اور اس کا مال سب اللہ کا عطا کردہ ہے اس لیے نسان پر لازم ہے کہ آزمائش کے وقت رضائے الٰہی کی خاطر صبر و سکون سے کام لے۔ جب حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے نبوت کا اعلان فرمایا تو کفار نے آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ آپؐ کو جھٹلایا۔ آپؐ کا مذاق اڑایا۔ کسی نے (معاذ اللہ) جادوگر کہا اور کسی نے کاہن، مگر آپؐ نے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور تبلیغِ دین سے منہ نہ موڑا۔

ایک دن حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم خانۂ کعبہ کے نزدیک نماز پڑھ رہے تھے۔ حرم شریف میں اس وقت کفار کی ایک جماعت موجود تھی۔ عقبہ بن بی مُعیط نے، بوجہل کے اکسانے پر اونٹ کی اوجھڑی سجدے کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر ڈال دی اور مشرکین زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ کسی نے آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ وہ فوراً دوڑی ہوئی آئیں اور غلاظت آپؐ کی پشت سے دور کی اور ان کافروں کو بد دعا دی۔ اس پر حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا۔ "بیٹی! صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے۔ یہ نہیں جانتے کہ

ان کی بہتری کس چیز میں ہے۔"

ابولہب حضورؐ کا چچا تھا۔ لیکن جب سے حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے تبلیغ دین شروع کی وہ اور اس کی بیوی امِ جمیل دونوں آپؐ کے دشمن ہو گئے۔ ابولہب نے یہ کہنا شروع کیا "لوگو (معاذ اللہ) یہ دیوانہ ہے۔ اس کی باتوں پر کان نہ دھرو۔" اس کی بیوی حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی کئی مرتبہ آپؐ کے تلوے لہولہان ہو گئے۔ مگر آپؐ نے نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اس تکلیف کو برداشت کیا۔ کبھی بددعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھائے۔

دشمنانِ حق نے جب یہ دیکھا کہ ان کی تمام تدبیروں کے باوجود حق کا نور چاروں طرف پھیلتا جا رہا ہے تو انھوں نے نبوت کے ساتویں برس محرم الحرام میں خاندانِ بنوہاشم سے قطع تعلق کر لیا، جس کی رُو سے تمام قبائلِ عرب کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ بنو ہاشم سے ہر طرح کا لین دین اور میل جول بند کر دیں اور ابولہب کے سوا پورا خاندانِ بنوہاشم تین سال تک حضرت محمد مصطفےٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہا۔ اس دوران انھوں نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر اس موقع پر "رحمۃ للعالمینؐ" نے نہایت صبر و ضبط اور بڑی پامردی و استقامت سے ان حالات کا مقابلہ کیا۔ اسی طرح آپؐ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ بھی رضائے الٰہی کی خاطر مصروفِ جہاد رہے اور اس راہ میں پیش آنے والی تمام تکلیفوں کو بے مثال صبر و استقامت اور پامردی سے برداشت کرتے رہے۔

عفو و درگذر

عفو و درگذر ایک بہترین اخلاقی وصف ہے۔ اس سے دشمن دوست ہو جاتے ہیں اور دوستوں میں محبت بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کے لیے جو صفات پسند فرمائی ہیں۔ ان میں عفو و درگذر بھی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ

(سورۂ آلِ عمران: ۱۳۴)

ترجمہ: اور وہ (مومن)، غصہ پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں۔

رسول اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم مسلمانوں کی غلطیوں کو تو معاف فرمایا ہی کرتے تھے لیکن دشمنوں سے بھی عفو و درگذر کرتے تھے۔ ایک دفعہ رسول اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے وادیٔ طائف کا قصد فرمایا کہ ان لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دیں۔ طائف کے سرداروں نے آپؐ کی دعوت قبول کرنے کی بجائے نہایت تکلیف دہ سلوک کیا اور آپؐ پر اتنے پتھر برسائے کہ جسم لہولہان ہوگیا اور جوتے خون سے بھر گئے۔ اس وقت جبرائیلِ امین عَلَيْهِ السَّلَام تشریف لائے اور اللہ کے حکم سے انھوں نے عرض کیا۔ "آپؐ حکم دیں تو طائف کے دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں اور یہ لوگ پس کر نیست و نابود ہو جائیں۔" مگر حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے نہ صرف یہ کہ انھیں معاف فرمایا بلکہ دعا فرمائی "اے اللہ ان کو ہدایت دے۔"

فتح مکہ کے موقع پر صحنِ کعبہ میں قریش کا اجتماع تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جنھوں نے دس سال تک رسول اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم اور صحابہ کرامؓ کو بے اندازہ تکلیفیں پہنچائی تھیں جس کی وجہ سے مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی تھی۔ اب یہ لوگ مجبور و بے بس تھے اور ڈر رہے تھے کہ نہ جانے ان سے کس قسم کا انتقام لیا جائے گا۔ رسول اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے ان کی طرف توجہ کی اور پوچھا: "اے گروہِ قریش تم جانتے ہو میں تمھارے ساتھ کیا برتاؤ کرنے والا ہوں"؟ انھوں نے جواب دیا۔ "آپؐ نیک برتاؤ کریں گے۔ کیونکہ آپؐ مہربان ہیں اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں۔" آپؐ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی اور سب کو معاف کر دیا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ
اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

(سورۂ یوسف: ۹۲)

ترجمہ : تم پر آج کوئی الزام نہیں۔ اللہ تمھارا قصور معاف کرے۔ وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

ذکر

ذکر کے معنی ہیں کسی کو یاد کرنا۔ دین کی اصطلاح میں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار اللہ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا حکم آیا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا

(سورۃ الاحزاب : ۴۱)

ترجمہ : اے ایمان والو تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔

مؤمنوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۝

(سورۃ النور ۳۰)

ترجمہ : وہ ایسے مرد ہیں جن کو نہ تجارت اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت۔

اور ذکر کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (سورۃ الرعد ۲۸)

ترجمہ : معلوم ہے اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔

سب سے بہتر ذکر الٰہی نماز ہے۔ اس میں دل، زبان اور پورا جسم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم بکثرت نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم اتنی دیر تک نماز میں اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے کہ پائے مبارک سوج جاتے۔ میں عرض کرتی یا رسول اللہ! آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت لکھ دی ہے پھر آپؐ کیوں اتنی مشقت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا! کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

کثرت سے یادِ الٰہی میں مشغول رہنا، راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھنا رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ آپؐ فرض نمازوں کے ساتھ نوافل کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ خصوصاً صبحِ صادق سے پہلے رات کو اٹھ کر نماز تہجد کا۔ اس کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی آیا ہے:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ
رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (سورۃ الاسراء : ۷۹)

ترجمہ: اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کیجیے جو آپؐ کے حق میں زائد چیز ہے، امید ہے آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود دے۔

نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ بہترین ذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ ذکر کے اور بھی بہت سے مسنون طریقے ہیں جو کہ احادیث کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ نماز کے بعد تینتیس تینتیس مرتبہ سبحان اللہ و الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہنا بھی ذکرِ مسنون ہے۔

سوالات

۱۔ رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے رحمۃ للعالمین ہونے پر ایک نوٹ لکھیں۔
۲۔ اخوتِ اسلامی کیا ہے؟ اور مسلمانوں کے درمیان رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے کیسے اخوت قائم کی؟
۳۔ مساوات کے بارے میں رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟
۴۔ رسول پاکؐ کے عفو و درگزر پر ایک نوٹ لکھیں۔ یا آپ کے صبر و استقلال پر نوٹ لکھیں۔
۵۔ ذکر سے کیا مراد ہے؟ ذکرِ الٰہی کی اقسام اور اس کے فضائل لکھیں۔

باب چہارم

تعارُفِ قرآن وحدیث

تعارف قرآن مجید

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے جو کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے ان میں قرآن مجید آخری مکمل اور ابدی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے فضائل وبرکات اور علوم واسرار بے حد وحساب ہیں۔

قرآن مجید کے اسماء قرآن مجید کے اسماء کے بارے میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔ جن میں سے کتاب البرہان کا بیان بھی ہے کہ قرآنِ کریم کے پچپن نام ایسے ہیں جو خود آیاتِ قرآنیہ سے ماخوذ ہیں۔ ان میں سے چند اسماء مبارکہ مندرجہ ذیل فہرست میں مذکور ہیں:

۱۔ الکتاب۔ دنیا کی تمام کتابوں میں کتاب کہلانے کا مستحق قرآن ہی ہے۔
۲۔ الفرقان۔ سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے والی۔
۳۔ نور۔ روشنی اور ہدایت دکھانے والی۔
۴۔ شفاء۔ روحانی شفاء اور پیغامِ صحت۔
۵۔ تذکرۃ۔ عبرت ونصیحت کا سامان۔
۶۔ العلم۔ یہ کتاب سراپا علم ومعرفت ہے۔
۷۔ البیان۔ اس کتاب کی ہر تعلیم وضاحت سے پیش کی جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کی چند صفتوں کا بھی بیان فرمایا ہے۔ مثلاً:

حکیم۔ حکمت والا۔

مجید۔ بزرگ۔
مبارک۔ بابرکت۔
العزیز۔ زبردست عزت والا۔
مبین۔ ہدایت کو واضح کرنے والا۔
کریم۔ کرامت اور بزرگی والا۔

اس کتاب کی خوبیوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس کے مضامین و مطالب کی کوئی حد نہیں۔ کوئی شخص بھی جس کے دل میں ہدایت کی سچی تڑپ ہو وہ اپنی فہم کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

فضائل قرآن مجید قرآن مجید کے فضائل بہت سی آیات و احادیث میں مذکور ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ
شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۥ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔

(سورۂ یونس: ۵۷)

ترجمہ: اے لوگو! تمھارے پاس اپنے پروردگار کی طرف سے ایک پیغام نصیحت آ چکا ہے۔ جو دلوں کی بیماریوں کا علاج اور مؤمنوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت باعثِ برکت اور موجبِ اجر و ثواب ہے۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن کریم کا ایک حرف پڑھے اس کے لیے اس حرف کے عوض ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا اجر دس نیکیوں کے برابر ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے (گویا ایک لفظ میں تین حروف ہوئے جس کے بدلے میں تیس نیکیاں ملیں گی۔

حضرت معاذ جُہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ

وَسَلَّم نے فرمایا کہ "جس شخص نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا تو اس کے والدین کو روزِ قیامت ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی سے بہتر ہوگی۔"

قرآن مجید پر عمل دنیا اور دین کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

> "اے لوگو! نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سی قوموں کو عزت و سربلندی عطا کرتا ہے (ایمان و عمل کے ذریعے) اور بہت سوں کو (اس سے روگردانی کرنے پر) ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔"

وحی کیا ہے؟ وحی کے لغوی معنی خفیہ طور پر لطیف انداز میں اشارے سے بات کرنے کے ہیں۔ شریعت کی اِصطلاح میں وحی سے مراد وہ پیغامِ الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ انبیاءِ کرام کو عطا کرتا ہے۔ حواس، عقل اور دیگر مادی ذرائع سے ملنے والے علم کے مقابلے میں وحی کے ذریعے حاصل ہونے والا علم زیادہ یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔ تمام انبیائے کرام وحی الٰہی کی رہنمائی میں اپنی اپنی امتوں کے لیے فریضہ تبلیغ و رسالت ادا کرتے رہے۔ حضرت محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم پر دین کی تکمیل ہو چکی ہے۔ قرآن مجید کی صورت میں آخری وحی الٰہی محفوظ ہو چکی ہے جو روزِ قیامت تک ہدایت کے لیے کافی ہے۔ اس لیے آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے بعد وحیِ آسمانی کا نزول اور نبوت و رسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔

نزولِ قرآن قرآنِ کریم نزول سے پہلے لوحِ محفوظ میں مکتوب تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ (سورۃ البروج)

ترجمہ: بلکہ یہ ایک قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں ہے۔

پھر لیلۃ القدر میں جو رمضان المبارک میں ہے، یہ پورے کا پورا لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ۔

(سورۃ البقرہ ۱۸۵)

ترجمہ : رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔

اور

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (سورۃ القدر ۱)

ترجمہ : بیشک ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حکمت اور فیصلے کے مطابق اس کا نزول حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے خاتم النبیین محمد صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم پر شروع ہوا۔ جب آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم کی عمر مبارک چالیس سال کو پہنچی تو آپ بکثرت سچے خواب دیکھا کرتے تھے۔ جو حرف بحرف پورے ہوتے تھے۔ ان دنوں آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم مکے سے تین میل کے فاصلے پر فاران نامی پہاڑ کے حرا نامی غار میں کئی کئی دن تنہائی میں گزارتے اور عبادت میں مصروف رہتے۔ اچانک ایک دن جبرئیل علیہ السلام ظاہر ہوئے اور آپؐ سے فرمایا:

"اِقْرَأْ" (پڑھیے) آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے فرمایا: "مَآ اَنَا بِقَارِئٍ" (میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) جبرئیل امین عَلَیْهِ السَّلَام نے آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم کو سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر چھوڑ کر کہا "اِقْرَأْ" (پڑھیے) آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے پھر وہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ پھر جبرئیل عَلَیْهِ السَّلَام نے ایسا ہی کیا اور پھر سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات پڑھیں۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ روزِ قیامت تک تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کا عظیم بارِ امانت تھا جو آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم پر ڈال دیا گیا تھا۔ آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم کے قلب مبارک پر اس کا بڑا اثر تھا۔ واپس آکر آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے اُمّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو۔ جب کچھ سکون ہوا تو آپ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم نے تمام واقعہ حضرت

خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سنایا۔ وہ آپؐ کے اطمینان کی خاطر آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ جو نہایت عمر رسیدہ اور تورات کے بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے حالات سن کر کہا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔

اس کے بعد کچھ عرصے تک کوئی وحی نہ آئی۔ اسے "فَتْرَۃُ الْوَحْی" کا زمانہ کہتے ہیں۔

اس کے بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس کے بعد مسلسل قرآن مجید موقع اور محل کے مطابق تقریباً بیس سال تک نازل ہوتا رہا۔ اس طرح نزولِ وحی کا کل زمانہ ۲۳ سال کے لگ بھگ ہے۔ عام طور پر تین تین، چار چار آیتیں ایک ساتھ اترتیں۔ بعض اوقات زیادہ آیتیں یا پوری سورۃ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم پر نازل ہو جاتی۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کاتبانِ وحی کو بلا کر ہر وحی کو اس کی متعلقہ سورۃ میں لکھو لیتے۔

مکّی اور مدنی سورتیں

جمہور مفسرین کے نزدیک مکّی سورتوں سے مراد وہ سورتیں ہیں جو ہجرتِ نبویؐ سے پہلے مکّی دور میں نازل ہوئیں۔ خواہ وہ حدودِ مکّہ سے باہر ہی نازل ہوئی ہوں۔ جب کہ مدنی سورتوں سے مراد وہ سورتیں ہیں جو ہجرت کے بعد کے زمانے میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی رحلت کے زمانے تک نازل ہوئیں۔ مکّی سورتوں کی تعداد ۸۷ اور مدنی سورتوں کی تعداد ۲۷ ہے۔ اس طرح سورتوں کی مجموعی تعداد ۱۱۴ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کا فرق مکّی اور مدنی سورتوں میں طرزِ بیان، معانی اور مضامین وغیرہ کے لحاظ سے کافی فرق ہے۔ مثلاً مکّہ مکرمہ میں جو آیات اور سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر اصول اور کلیات دین کا بیان ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ توحید باری تعالیٰ کے اثبات اور شرک کے ابطال کے لیے غور و فکر اور کائنات اور خود وجودِ انسانی میں تدبّر کی طرف توجہ دلائی

گئی ہے۔ بُت پرستی اور شرک کی مذمت ایسے سادہ اور مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی شرک سے متنفّر ہو کر توحید کا پرستار بن جائے۔ سابقہ اقوام کے وہ قصے بار بار مختلف اسالیب میں بیان کیے گئے ہیں جن سے اہلِ عَرب اچھی طرح واقف تھے اور ان میں عبرت و نصیحت کے واضح نشانات موجود تھے۔ آخرت اور موت کے بعد زندگی کو ذہن نشین کرانے کے لیے نہایت مؤثر انداز میں خطاب کیا گیا ہے۔ مکّی سورتوں کے جملے چھوٹے چھوٹے اور ایسے دل نشیں ہیں کہ سنتے ہی ذہن نشیں ہو جاتے اور دل میں اتر جاتے ہیں۔

مدنی سورتوں کے مخاطب اہلِ کتاب اور مسلمان تھے۔ اس لیے ان میں ان کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر قرآن مجید کو سابقہ آسمانی کتابوں کا مؤید اور مصدق بتایا گیا ہے۔ سابقہ آسمانی کتابوں میں نبی آخر الزماں صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے بارے میں مذکورہ پیشین گوئیاں یاد دلائی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ تورات و انجیل پر ایمان رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن پر پورا پورا ایمان لایا جائے۔

مدنی آیات اور سورتوں کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر عبادات اور معاملات سے متعلق احکام، حلال و حرام، فرائض و واجبات اور ممنوعات و منہیات کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ غزوات و جہاد، مالِ غنیمت، خراج، جزیہ، میراث اور حدود و قصاص کے تفصیلی احکام بھی مدنی سورتوں کے خاص مضامین ہیں۔

حفاظت و تدوین قرآن مجید قرآن مجید بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی آخری کتاب ہدایت ہے۔ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے قبل نازل ہونے والے صحیفوں کا مقررہ زمانہ گزر جانے اور ان کے منسوخ ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید کو نازل کیا جائے جو قیامت تک انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری، مکمل اور ناقابلِ تنسیخ ہدایت نامہ ہو۔ قرآن مجید کی اسی اہمیت اور امتیازی شان کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ اس کی حفاظت اور بقا کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود

لی اور قیامت تک کے لیے اس کے ایک ایک حرف کی حفاظت کا انتظام کر دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

ترجمہ: بے شک ہم ہی نے قرآن کو اتارا اور بے شک ہم ہی اس کی البتہ حفاظت کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن مجید کی حفاظت کے لیے جو انتظامات فرمائے گئے ان میں سے دو اہم طریقے صدری حفاظت اور کتابی حفاظت کے ہیں۔

۱۔ صدری حفاظت (سینوں کے ذریعے) صدر سینے کو کہتے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی امتیازی شان ہے کہ اسے کتابی شکل میں محفوظ کرنے سے پہلے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم اور ان کے صحابہ کرامؓ کے سینوں میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید کو تیئیس سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا موقع بموقع نازل کیا جاتا رہا۔ جیسے ہی کوئی سورت یا آیات نازل ہوتیں، صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد اسے حفظ کرنے میں لگ جاتی اور پھر وہ بار بار آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے سامنے اِعادہ کر کے یہ اطمینان حاصل کرتے کہ انھوں نے صحیح طریقے سے اسے حفظ کر لیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت نماز میں لازمی قرار دی گئی۔ قرآن مجید کی تعلیم و تعلّم کے فضائل موقع بموقع بیان کیے جاتے تھے۔ نیز حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے تمام مساجد میں قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام فرما دیا تھا۔ بعض مکانات[1] کو بھی مدارسِ قرآن مجید کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں بعض صحابہ کرام کو معلّم قرآن بنا کر دور دراز علاقوں میں بھیجا جاتا تھا[2]۔ مسجدِ نبوی کے قریب صفہ (چبوترہ) درسِ قرآن کا زبردست مرکز تھا۔ جہاں سینکڑوں مسافر طلبہ روز و شب قرآن مجید کے حفظ اور درس و

---

[1] جیسے مدینہ میں مخرمہ بن نوفل کا مکان۔

[2] جیسے حضرت عبد اللہ بن ام مکتومؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ وغیرہ۔

تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ انہی اسباب کی بنا پر ابتدائے اسلام ہی سے ہر چھوٹے بڑے اور مرد و عورت کی توجہات کا اولین مرکز حفظ قرآن بن گیا تھا۔ جس کی بدولت قرآن مجید ان کی رگ رگ میں رچ بس گیا۔ مؤمنین کی اس صفت کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے:

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنٰتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (سورۃ العنکبوت، ۴۹)

ترجمہ: بلکہ یہ (قرآن) تو روشن آیتیں ہیں جو اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہیں
اور ہماری آیتوں کا انکار فقط ظالم لوگ ہی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عہدِ رسالت میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو مکمل قرآن مجید یا اس کے اکثر حصے زبانی یاد ہو گئے تھے اور یہی طریقہ ہمیشہ سے مسلمانوں میں چلا آ رہا ہے۔ مسلمان کسی جگہ بھی ہوں، اقلیت میں یا اکثریت میں، حفاظِ قرآن کی ایک بڑی جماعت ان میں موجود رہتی ہے۔ اسی متواتر اور مسلسل حفظ و تعلیم کی بناء پر قرآن مجید کا ایک ایک حرف آج تک تحریف و تبدل سے محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔

۲۔ کتابی حفاظت عرب ظہورِ اسلام سے قبل امی تھے۔ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہ تھا۔ بلکہ ان کا سارا دارومدار حافظہ اور روایت پر تھا۔ اس لیے ان میں نہ تو لکھنے والے موجود تھے، نہ لکھنے کے سامان کا کوئی انتظام تھا۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ نزول سے کچھ عرصے قبل عرب لکھنے لکھانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ بعثتِ نبوی کے وقت مکّہ مکرمہ میں صرف سترہ افراد ایسے تھے جو لکھنے کے فن سے واقف تھے۔ ان میں سے بعض ابتدائے اسلام ہی میں مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے شروع ہی سے قرآن مجید کی کتابت کا پورا انتظام وجود میں آ چکا تھا۔ خود قرآن مجید کی اولین نازل شدہ آیات (سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات) میں تعلیم بالقلم کو ایک بڑی نعمت قرار دیا گیا اور قرآن مجید کو ایک لکھی ہوئی کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ سورۂ طور کی ابتدائی آیات میں فرمایا گیا:

وَالطُّوْرِ ○ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ

ترجمہ: قسم ہے طور (پہاڑ) کی اور اس کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے کشادہ اوراق میں۔

چونکہ کاغذ کا رواج نہ تھا۔ اس لیے کتابتِ قرآن مجید کے لیے جو چیزیں استعمال کی گئیں ان میں اونٹ کے شانے کی چوڑی ہڈیاں، تختیاں، کھجور کی شاخوں کے ڈنٹھل، باریک سفید پتھر کے ٹکڑے، کھال یا پتلی جھلی کے ٹکڑے اور چمڑے کے ٹکڑے وغیرہ شامل تھے۔ جونہی کوئی سورۃ نازل ہوتی حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کاتبینِ وحی میں سے کسی کو بلا کر حکم فرماتے کہ اس آیت کو اس سورۃ میں درج کرو جس میں فلاں بات کا ذکر ہے۔ اس طرح نازل شدہ آیات کے صحیح مقام سے آگاہ فرما کر اس کی کتابت کروا لیتے تھے۔ صحابہ کرامؓ حفظ کے علاوہ اس قسم کے صحیفے اپنے پاس رکھتے اور تلاوت کے لیے سفر میں ساتھ لے جایا کرتے۔

اگرچہ قرآن مجید کی تمام آیات کریمہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے اپنے کاتبوں سے لکھوائی تھیں۔ تاہم انھیں ایک مصحف میں جمع نہیں فرمایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید کی کئی سورتوں کا نزول بیک وقت جاری رہتا۔ نزول کی ترتیب اس طرح نہیں تھی جس طرح آج قرآن مجید ہمارے پاس لوحِ محفوظ کی ترتیب کے مطابق موجود ہے۔ اس لیے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے نزولِ قرآن کے زمانے میں ایک مصحف میں کتابی شکل میں آیات مبارکہ کو جمع نہیں فرمایا۔ البتہ ہر سورت اور آیت کا صحیح مقام بتا کر اس کے مطابق حفظ کروایا اور مختلف اشیاء پر کتابت کروا کر امت کے حوالے کر دیا۔

جمع و تدوین قرآن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں

جس طرح قرآن مجید حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے بتائے ہوئے الفاظ اور ترتیب کے ساتھ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں صحابہ کرامؓ کے سینوں میں محفوظ ہوا۔ اسی طرح نزول کی تکمیل اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی رحلت کے فوراً بعد کتابی صورت میں جمع ہونے کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے فرما دیا۔ اس مہم کی طرف سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کی توجہ اس وقت مبذول ہوئی جب جنگ یمامہ میں کئی سو حفاظ و قُرّاء شہید ہوگئے۔ اس پر انھوں نے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ:

إِنِّي آرَى أَنْ تَأْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْآنِ

ترجمہ: میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن مجید کو کتابی صورت میں جمع کرنے کا حکم فرمائیں۔

شروع میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس بارِ عظیم کو اٹھانے کے حق میں نہ تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جب حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے خود ایسا نہیں کیا تو ہمارے لیے ایسا کام کرنا کب درست ہو سکتا ہے۔ مگر بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بار بار توجہ دلانے سے ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ کتابت قرآن مجید تو عین سنت نبویؐ ہے اور یہ کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم خود مختلف اشیاء پر قرآن مجید کی کتابت کروا چکے ہیں۔ اس لیے اس کا ایک مصحف میں جمع کرنا عین منشاءِ نبویؐ کے مطابق ہے۔

جب اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اس رائے پر متفق ہوگئے تو کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس خدمت کے انجام دینے پر مامور کیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ اگرچہ حافظ قرآن تھے اور ان کے پاس اپنا مصحف بھی موجود تھا، تاہم فقط یادداشت کی بنیاد پر قرآن مجید کو جمع کرنے کی بجائے طریقہ یہ مقرر کیا گیا کہ جن لوگوں کے پاس مختلف نوشتے تھے۔ ان سے منگوا کر دو گواہوں کے سامنے یہ شہادت لی جاتی کہ یہ نوشتہ حضور صلی اللہ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے روبرو لکھا گیا ہے۔ کتابت قرآن کے لیے حضرت زید بن ثابتؓ کی سربراہی میں ۷۵ صحابہ کرامؓ کی مستقل کمیٹی بنائی گئی تھی۔ جن میں ۲۵ مہاجر اور ۵۰ انصاری صحابہ شامل تھے۔ حضرت سعید بن العاصؓ کی فصاحت اور لہجہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم سے مشابہ تھا۔ اس لیے املاء کا کام ان کے ذمے ڈالا گیا۔ اس طرح اجماع صحابہ سے قرآن مجید کا ایک نسخہ تیار کروایا گیا۔ جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کے قبضے میں رہا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد ان کی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں امانت کے طور پر رکھ دیا گیا۔

جمع قرآن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں

عرب کے مختلف قبائل، لہجے اور بعض لغات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھے۔ ہجرت کے بعد جب مختلف عرب قبائل مشرف باسلام ہونے لگے تو لغات اور لہجوں کے اختلاف کی وجہ سے ان کے لیے قریشی لہجے میں قرآن کی تلاوت کرنا دشوار تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مختلف احرف (لہجوں) میں قرآن مجید پڑھنے کی اجازت دے دی گئی، اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا
تَيَسَّرَ مِنْهُ

ترجمہ: بیشک یہ قرآن سات احرف (لہجوں) سے نازل ہوا ہے۔ پس ان میں سے اس لہجے سے پڑھو جو تمھارے لیے آسان ہو۔

اس طریقے پر نزول قرآن حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی مدنی زندگی کے اواخر تک ہوتا رہا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اسلامی خلافت کی حدود وسیع تر ہوگئیں تو مختلف احرف سے قرآن مجید کی قرائت سے بعض اوقات الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا ہونے لگیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہ کو جمع کرکے اس خطرے سے آگاہ کیا اور فرمایا:

> ”اے محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے ساتھیو! تم جمع ہوکر لوگوں کے لیے ایک رہنما اور امام مصحف لکھو۔“

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت کو حکم دیا کہ دوبارہ صحابہ کرامؓ کے متفرق نوشتوں سے قرآن کریم کو جمع کریں اور جس جگہ لہجے کا اختلاف ہو وہاں لغت قریش کو معیار مانا جائے۔ کیوں کہ قرآن لغت قریش پر ہی نازل ہوا۔ اس طریق پر جب مصحف کی کتابت ۲۴ھ کے اواخر اور ۲۵ھ کے اوائل میں مکمل ہوگئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد کا جمع کردہ مصحف منگوایا اور اس سے لفظ بلفظ تقابل اور اطمینان حاصل کرلینے

کے بعد اس کی پشت پر یہ عبارت لکھی گئی؛

هٰذَا مَا اَجْمَعَ عَلَيْهِ جَمَاعَةٌ مِّنْ اَصْحَابِ الرَّسُوْلِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ

ترجمہ: یہ وہ نسخہ قرآن ہے جس پر حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وسلم کے صحابہ کی جماعت نے اجماع و اتفاق کیا ہے۔

اس مصحف کو "مصحف امام" کا نام دیا گیا اور اس کی سات نقلیں کر کے مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ اور مدینہ منورہ جیسے مرکزی مقامات پر رکھو دی گئیں۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللّٰہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کی انتھک محنت کے باعث قرآن مجید ایک ہی لہجے اور لغت پر ساری دنیا میں رائج ہوا۔

قرآن مجید کی خوبیاں قرآن مجید میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جن کے سبب یہ کتاب زندۂ جاوید بن گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کا شمار ناممکن ہوگا۔ تاہم چند خوبیوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن مجید ایک سچی کتاب ہے۔ اس کی دعوت اور پیغام بھی سچائی سے بھرپور ہے۔ اس کے دلائل نہایت مضبوط اور مستحکم ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ
حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ
(سورۂ ہود : ۱)

ترجمہ: یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے۔

چونکہ دلائل نہایت مضبوط ہیں اور سچائی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اس لیے تضاد سے پاک ہیں۔ اس کے مضامین میں ذرہ بھر بھی اختلاف نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

(سورۃ النساء : ۸۲)

ترجمہ : اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوائے اللہ کے تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت ۔

(۲) اس کتاب نے ان افراد اور اقوام کی کامیابی کی ضمانت دی ہے جو سچے دل سے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے لیے یہ کتاب اِس جہان میں بھی شرف و امتیاز کا وعدہ کرتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت عمرؓ نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔ ” اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کتنی ہی قوموں کو بلندی بخشے گا اور کتنوں کو پست کرے گا۔“ (صحیح مسلم)

حضرت عمرؓ کی ہی زندگی کو لیجیے اس کتابِ ہدایت کا اثر تھا جس نے حضرت عمرؓ کی زندگی کو یکسر بدل دیا۔ وہ عمرؓ جو اپنے والد خطاب کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کے والد انھیں جھڑکا کرتے تھے اور یہ قوت و عزم میں قریش کے متوسط لوگوں میں سے تھے۔ وہی عمر اسلام قبول کر لینے کے بعد تمام عالم کو اپنی عظمت و صلاحیت سے مُتحیر کر دیتے ہیں اور ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالتے ہیں جو قیصر و کسریٰ کی حکومتوں پر حاوی ہے۔ تدبیر سلطنت میں ہمیشہ کے لیے وہ رہنما اصول مقرر کرتے ہیں جن پر ساری دنیا فخر کرتی ہے۔ اتنی بڑی سلطنت کے سربراہ ہونے کے باوجود وَرَع و تقویٰ میں بے مثل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص جس قدر اس کتاب کے قریب ہوگا اسی قدر اسے شرف و امتیاز نصیب ہوگا اور جس قدر اس کتاب کی تعلیمات سے روگردانی کرے گا اسی قدر وہ ذلت و خواری کا شکار ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آج بھی مسلمان مل کر قرآن کی راہ پر چلیں تو وہ عزت و شرف یقیناً آج بھی انھیں نصیب ہو سکتا ہے۔

(۳) تربیت و تزکیہ کے لحاظ سے اس کتاب میں بلا کی خوبی ہے۔ اس کی تربیت سے انسانی قلب و دماغ، جذبات و خواہشات، رجحانات، میلانات اور سیرت و کردار کا بخوبی تزکیہ ہوتا ہے جس کی بدولت انسان اخلاقی فضائل اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور پھر اس کی ہر بات دل میں اتر جاتی ہے۔ اس کی تلاوت سے جہاں قلب میں خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے وہاں عزم و یقین کی دولت بھی نصیب ہوتی ہے۔

قرآن مجید کی تاثیر قرآن مجید چونکہ کلامِ الٰہی ہے اس لیے اس میں پڑھنے والوں

کے لیے بلا کی تاثیر رکھ دی گئی ہے۔ اس تاثیر کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا
مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ (سورۃ الحشر: ۲۱)

ترجمہ: اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔

یہ اسی تاثیر کا سبب ہے کہ ایک مؤمن اس کی تلاوت کے دوران میں ایک عجیب کیفیت اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ یہی دراصل ایمانی کیفیت ہے، جو تعلق باللہ میں استواری، اور قرآنی تعلیمات کو اپنے اندر جذب کرنے کا باعث بنتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب حضورؐ صحابہؓ سے قرآن مجید سنتے تو اس موقع پر آپؐ پر رقت کی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس بارے میں ایک حدیث ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ میں نے عرض کی اے خدا کے رسولؐ میں آپؐ کو قرآن سناؤں حالانکہ آپؐ پر قرآن نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا میں اوروں سے قرآن سننا پسند کرتا ہوں۔ چنانچہ میں سورۂ نساء پڑھنے لگا۔ جب میں اس آیت پر پہنچا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى
هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۝
(سورۃ النساء: ۴۱)

ترجمہ: پھر کیا حال ہوگا جب بلادیں گے ہم ہر امت میں سے احوال کہنے والا اور بلادیں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا۔

تو آپؐ نے فرمایا اب بس کرو۔ میں نے آپؐ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ قرآن کی تلاوت کے دوران میں صحابہؓ کی کیا کیفیت تھی۔ اس بارے میں مفسر ابن کثیر اپنی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں: "وہ نہ چیختے تھے اور نہ تکلف سے کام لے کر کسی مصنوعی کیفیت کا مظاہرہ کرتے تھے، بلکہ وہ ثبات و سکون، ادب و خشیت

میں اس قدر ممتاز تھے کہ ان صفات میں ان کی کوئی برابری نہ کر سکا۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴، صفحہ ۵)

مؤمن کا دل تلاوتِ قرآن کے وقت جہاں کانپ اٹھتا ہے اس کے ساتھ اس کے دل میں سکون و سکینت بھی طاری ہوتی ہے۔ گویا بدن اور دل کے نرم پڑنے کا مطلب ہی سکون کو حاصل ہو جانا ہے جو رحمت الٰہیہ کے نزول کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت سکون و رحمت کا نزول ہوتا ہے، اس لیے اس وقت رحمتِ الٰہیہ کا امیدوار بننے کے لیے قرآن مجید کو توجہ اور خاموشی سے سننے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُونَ ۝ (سورۃ الاعراف: ۲۰۴)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار وہی لوگ ہیں جو قرآن مجید کو توجہ سے سنتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے قرآن ان کے دلوں میں اتر جائے۔

حدیث اور سنت

حدیث کے لغوی معنی خبر یا بات چیت کے ہیں۔ شریعت اسلامی کی رو سے حدیث اس خبر کا نام ہے جس کے ذریعے ہمیں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا کوئی قول، فعل یا تقریر معلوم ہو۔ اس طرح حدیث کی تین قسمیں بنتی ہیں جو درجِ ذیل ہیں:

حدیث قولی وہ ہے جس میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے کسی بات کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کچھ فرمایا ہو یا اس میں کسی معاملے میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی دی ہوئی زبانی ہدایات کا تذکرہ ہو۔

حدیث فعلی وہ ہے جس میں راوی نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا

اختیار کردہ کوئی عمل اور طریقہ بیان کیا ہو۔

حدیث تقریری سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں ایسے امور کا تذکرہ ملے جو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے سامنے واقع ہوئے ہوں اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے ان پر خاموشی اختیار فرمائی ہو، اس لیے کہ اگر اس معاملے میں کوئی بات ممنوع یا قابلِ وضاحت ہوتی تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم ضرور اس بارے میں رہنمائی فرماتے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا ان امور پر خاموش رہنا ان کی تصدیق کے مترادف ہے۔

سنت کے لفظی معنی طریقے اور راستے کے ہیں خواہ اچھا ہو یا برا۔ اِصطلاحِ شریعت میں سنتِ رسول کے معنی حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے اختیار کردہ اور ہدایت کردہ طریقے کے ہیں۔ جمہور محدّثین کے نزدیک نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے جملہ اقوال، افعال، تقریرات، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے اخلاق جلیلہ، مغازی حتیٰ کہ بعثت سے قبل کے احوال بھی سنت کے ضمن میں آتے ہیں۔

حدیث یا سنت کی شرعی حیثیت

شریعت اسلامی کے چار بنیادی ماخذ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم، اجماع اور قیاس ہیں ان میں سنت رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کو دوسرا بنیادی مقام حاصل ہے۔ حدیث "وحی" کی وہ قسم ہے جو اللہ تعالیٰ نے الفاظ اور عبارات کے بغیر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے قلب مبارک پر نازل فرمائی۔ اس امر پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے کہ حدیثِ نبوی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی پیروی واجب اور خلاف ورزی حرام ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار نصوص و آیات وارد ہوئی ہیں۔ یہاں ان میں سے چند پیش کی جاتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ

فَانْتَهُوْا ۝ (سورۃ الحشر: ۷)

ترجمہ: اور رسول تمھیں جو کچھ دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے باز رہو۔

اس آیت مبارک میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے جملہ احکام و ہدایات کو قبول کرنے اور منہیات سے رک جانے کا واضح حکم دیا گیا ہے۔ گویا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے جملہ احکام عین رضاءِ الٰہی کے مترادف ہیں۔ اس کی مزید توضیح ایک دوسری آیت مبارکہ سے ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (سورۃ النساء: ۸۰)

ترجمہ: جس نے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر ہر قسم کی لغزش اور خطا سے معصوم ہوتا ہے۔ تشریعی امور میں پیغمبر کا ہر قول، عمل اور اشارہ من جانب اللہ ہوتا ہے۔ اس میں اس کی ذاتی خواہش یا وسوسے کا احتمال نہیں ہوتا۔ اور اسے پوری طرح تائیدِ ربانی اور تصدیقِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (سورۃ النجم: ۳،۴)

ترجمہ: وہ (ہمارا رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم) اپنی مرضی و خواہش سے کچھ نہیں بولتا وہ تو وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔

حدیث شریعت کا دوسرا ماخذ اور قرآن مجید کی تفسیر اور عملی تعبیر ہے۔ پیغمبر صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا کام فقط آیاتِ قرآنیہ کا سنا کر یاد کروا دینا ہی نہیں، بلکہ ان کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ آیاتِ الٰہیہ کی موقع و محل کے مطابق توضیح و تشریح کرے، مختلف استعداد کے لوگوں کو ان کی ذہنی و علمی سطح کے مطابق اس کے اسرار و رموز سے آگاہ کرے، پھر ان کو اس کے مطابق عمل کی تربیت دے، اور ان کو اس راہ پر چلنے کے لیے خود عملی نمونہ دکھلائے۔ تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کے سلسلے میں افراط و تفریط

میں نہ پڑ جائیں۔ نیز ان کے نفوس کا اس طرح تزکیہ کرے کہ اتباعِ شریعت ان کی فطرتِ ثانیہ بن جائے اور اس کے ہدایت یافتہ شاگرد خود دوسروں کے لیے ہدایت کے ستارے بن جائیں۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے ان ہی فرائض کا تذکرہ مندرجہ ذیل آیات میں کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سورۃ الجمعہ: ۲)

ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان (کے نفوس) کو سنوارتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

قرآن کریم میں بہت سے امور مثلاً عبادات، حلال و حرام اور معاملات وغیرہ میں مجمل اصول و قواعد بتا دیے گئے ہیں اور ان کی تفصیل اور توضیح کا کام پیغمبر کے ذمے ڈال دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ
(سورۃ النحل ۴۴)

ترجمہ: ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم لوگوں کے لیے اس چیز کی وضاحت کریں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

اسی طرح بعض بڑے جرائم اور حدود کے بارے میں تو قرآن مجید نے سزائیں بتا دیں تاہم بقیہ جرائم کی تعزیرات کے سلسلے میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ
(سورۃ النساء ۵۹)

ترجمہ ، اگر تمہارا کسی معاملے میں آپس میں تنازعہ ہو تو اس (تنازعے) کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف حوالے کرو۔

اسی طرح مختلف متنازعہ امور میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قاضی و حکم بنانے اور ان کا فیصلہ دل و جان سے تسلیم کرنے کو ایمان کا بنیادی تقاضا بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۝ (سورۃ النساء ۶۵)

ترجمہ . تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تنازعات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم اور فیصلہ کنندہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں۔

خلاصہ یہ کہ احادیث نبویہ شریعت کے بنیادی ماخذ اور قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بغیر قرآن مجید اور احکام الٰہیہ کا تفصیلی علم ناممکن ہے۔ اس لیے حدیث پر عمل واجب اور موجب فلاح دارین ہے اور اس کا انکار کفر کے مترادف ہے۔

تدوین حدیث

ظہورِ اسلام کے وقت کتابت اور لکھنے پڑھنے کا رواج عربوں میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ گنے چنے افراد فنِ کتابت سے واقف تھے، جن میں سے اسلام قبول کرنے والے حضرات سے قرآن مجید کی وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی آیات کی کتابت کی خدمت لی جاتی تھی جب کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں عام طور پر زبانی روایت اور قوت حافظہ کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔

جب ہم ذخیرۂ احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں دو قسم کی احادیث ملتی ہیں۔ ایک تو وہ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابتِ حدیث سے منع کر دیا تھا اور دوسری قسم وہ ہے جس میں کتابتِ حدیث کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے لکھے گئے احکام و فرامین بھی ملتے ہیں۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شروع میں حدیث کے سلسلے میں کتابت سے ممانعت کا حکم کئی مصالح اور حکمتوں پر مبنی تھا۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ کتابت کا فن عام نہ تھا اس لیے حفظِ حدیث پر زور دیا گیا تاکہ زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں اور ان کی قوتِ حافظہ بھی ضائع ہونے کی بجائے مزید ترقی کرے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید کی طرف توجہ زیادہ رہے تاکہ یہ دلوں میں راسخ ہو جائے اور قرآن مجید کے ساتھ حدیث یک جا لکھنے کی اس لیے بھی ممانعت کی گئی کہ قرآن اور حدیث کے الفاظ آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ چونکہ سامانِ کتابت زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اور دائرۂ کتابت چند افراد تک محدود تھا، اس لیے قرآن و حدیث کے الفاظ کے التباس کا خدشہ ہو سکتا تھا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا:

> ”قرآن کے سوا مجھ سے سن کر کچھ نہ لکھو، جس نے قرآن کے سوا کوئی چیز مجھ سے لکھی ہو اسے مٹا دے۔“ (صحیح مسلم بروایت ابوسعید خدری)

تاہم یہ پابندی درج بالا مصالح کے تحت وقتی طور پر تھی۔ جب حالات بہتر ہو گئے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے کتابتِ حدیث کی اجازت دے دی جس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ شروع میں صرف حفظِ حدیث کے قائل تھے مگر بعد میں انھوں نے اپنی تمام مرویات کو تحریری طور پر محفوظ کر لیا تھا۔ جب کسی قسم کا شک و شبہ پیدا ہوتا تو اس مجموعے سے اس کی تصدیق کرتے۔ عمرو بن امیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے سامنے ایک حدیث پر گفتگو ہوئی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور ہمیں احادیث کی کتابیں دکھائیں اور کہا دیکھو وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔ بہت سے صحابہ کرامؓ کے ذاتی مجموعہ ہائے احادیث کے علاوہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے بہت سے معاہدات، صلحنامے، احکامات اور خطوط وغیرہ بھی ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔ مثلاً صلح حدیبیہ کا معاہدہ، شاہانِ مصر، روم و ایران کے نام خطوط یا فتح مکہ کے بعد جو خطبہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے دیا تھا۔ ابو شاہ یمنی کی درخواست پر انھیں لکھوا دیا تھا۔ حاکمِ یمن عمرو بن حزام کو تقرری کے وقت ایک تحریر لکھوائی تھی

جس میں فرائض ، صدقات ، طلاق ، صلوٰۃ وغیرہ کے متعلق ضروری احکام تھے۔

عہد صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں بھی عام طور پر زیادہ توجہ حفظِ حدیث کی جانب رہی۔ تاہم چونکہ لکھنے کا فن عام ہو رہا تھا اس لیے اکثر لوگ اپنی ذاتی سعی سے بعض نوشتے لکھنے لگے تھے۔ یہ دور پہلی صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا۔

یہ صحابہؓ اور اکابر تابعینؒ کا دور تھا۔ اس کے بعد دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب ۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ بنے۔ اس وقت تقریباً تمام صحابہ رضی اللہ عنہم دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔ بزرگ تابعین بھی اٹھتے جا رہے تھے اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے حفاظت حدیث کی نیّت سے تمام شہروں کے حکام کے نام فرامین بھیجے کہ احادیث نبویہ کو تلاش کر کے جمع کر دیا جائے اور یہ حکم بھی دیا کہ حادیث کے ساتھ خلفاء راشدین کے آثار کو بھی جمع کر لیا جائے۔ تاکہ احکامِ شریعت پر عملدرآمد کی شالیں بھی محفوظ ہو جائیں۔

آپ کے ان فرامین کا بہت اچھا نتیجہ نکلا اور جن لوگوں نے اس کا اثر قبول کیا، ان میں حجاز و شام کے مشہور عالم محمد بن مسلم بن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) بھی تھے۔ انھوں نے دن رات محنت کر کے احادیث کی ایک کتاب مرتب کی۔ جس کی نقلیں کروا کر حضرت عمر بن عبد العزیز نے مختلف بلاد میں بھجوائیں۔ ان کے علاوہ مدینے میں سعید بن المسیب، کوفے میں امام شعبی اور شام میں مکحول جیسے علماء موجود تھے۔ انھوں نے حدیث کی تدوین و اشاعت میں زبردست حصہ لیا۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس کام کو مزید وسیع کر دیا۔ اس کے بعد احادیث کی چھان پھٹک، فقہی ترتیب اور تدوین و تبویب کے کام پر پورے عالم اسلام میں توجہ دی گئی اور کئی ایک ضخیم و مستند کتب حدیث مرتب ہوئیں جن میں صحاح ستہ زیادہ مشہور ہوئیں جو مدتوں سے درسی کتابوں کے طور پر عالم اسلام میں مستعمل ہیں اور ان شرح و حواشی اور تنقیح و تشریح کے سلسلے میں ہر دور میں گرانقدر خدمات انجام دی گئی ہیں۔

صحاح ستہ (حدیث کی چھ مشہور کتابوں) اور اصول اربعہ اور ان کے مصنفین کی فہرست درجِ ذیل ہے:

صحاح ستہ:

(۱) صحیح بخاری۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ۔ (۱۹۴ تا ۲۵۶ ہجری)
(۲) صحیح مسلم۔ امام مسلم بن حجاج بن مسلم قشیریؒ۔ (ف ۲۶۱۔ ہجری)
(۳) جامع الترمذی۔ امام ابوعیسیٰ۔ محمد بن عیسیٰؒ۔ الترمذی۔ (ف ۲۷۹ ہجری)
(۴) سنن ابی داؤد۔ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعثؒ۔ (ف ۲۷۵ ہجری)
(۵) سنن النسائیؒ۔ امام ابوعبدالرحمان احمد بن علی النسائیؒ۔ (ف ۳۰۳ ہجری)
(۶) سنن ابن ماجہ۔ امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابنِ ماجہ القزوینیؒ (ف ۲۷۳ ہجری)

اصول اربعہ:

مندرجہ ذیل چار کتابیں فقہ جعفریہؒ کی مستند ترین ذخائر حدیث میں:

(۱) الکافی۔ ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینیؒ (ف ۳۲۹ ہجری)
(۲) من لایحضرہ الفقیہ۔ ابوجعفر محمد بن علی بن بابویہ قمیؒ (ف ۳۸۱ ہجری)
(۳) الاستبصار۔ ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ۔ (ف ۴۶۰ ہجری)
(۴) تہذیب الاحکام۔ ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسیؒ۔ (ف ۴۶۰ ہجری)

منتخب آیات

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ
يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

(سورۃ الاحزاب: ۷۰-۷۱)

ترجمہ: اے ایمان والو۔ ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی کہ سنوار دے تمہارے واسطے تمہارے کام اور بخش دے تم کو تمہارے گناہ اور جو کوئی کہنے پر چلا اللہ کے اور اس کے رسول کے اس نے پائی بڑی مراد۔

تشریح ان آیات کے شروع میں دو باتوں، یعنی اللہ تعالےٰ سے ڈرنے اور درست بات کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تقویٰ کے معنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے دین و شریعت کے احکام کی بجا آوری ہے۔ دوسری تاکید یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ درست بات کہے۔ جھوٹ وغیرہ کا اس میں احتمال نہ ہو۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور اس کے ساتھ ہی آخرت کی مغفرت کا وعدہ بھی فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(سورۃ الاحزاب ۲۱)

ترجمہ: تم لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

تشریح یہاں عام ضابطے کے طور پر مسلمانوں سے ارشاد فرمایا گیا کہ تمہیں روزمرہ کے کاموں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب مسلمانوں کے لیے نمونہ ہیں۔ جو شخص اپنی زندگی میں آپؐ کو نمونہ بنا کر جس قدر محاسن اپنے اندر پیدا کرے گا، اسی قدر اللہ کے ہاں مقبول ہو سکتا ہے۔ دنیا و آخرت کی تمام سعادتیں صرف آپؐ کی ذات کی اتباع، اطاعت اور تقلید سے وابستہ کر دی گئی ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (سورۃ آل عمران ۱۰۳)

ترجمہ: اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو۔

تشریح اس آیت میں اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے یعنی اس کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں میں تفرقہ بازی سے منع کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے احکام چھوڑ دیں۔ پھر عداوت، خود غرضی، حسد، کینہ اور بغض جیسی برائیاں پیدا ہو کر مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے کے خلاف کر دیتی ہیں۔ اور اس کے برعکس اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنا رہبر بنائیں اس کے احکام پر عمل کریں تو سب

برائیوں کی جگہ محبت، دوستی، اخلاص، مروّت، ہمدردی جیسی بھلائیاں پیدا ہوں گی۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (سورۃ الحجرات ۱۳)

ترجمہ: تم میں سے اللہ کے ہاں وہی زیادہ عزت کا مستحق ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

تشریح سیاق وسباق کے لحاظ سے آیت کا یہ ٹکڑا اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں مسلمانوں کو عیب جوئی اور طعن وتشنیع سے منع کیا گیا ہے۔ بسا اوقات برائیوں کا ارتکاب آدمی اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بہت بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھ لے۔ اس موقع پر ارشاد ربانی کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا چھوٹا بڑا ہونا یا معزز یا حقیر ہونا، ذات پت یا خاندان ونسب کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ قرآن کی زبان میں جو شخص جس قدر نیک خصلت، مؤدّب اور پرہیزگار ہے اسی قدر اللہ کے ہاں معزز ومکرم ہے۔ نسب کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ سب انسان حضرت آدم وحوّا کی اولاد ہیں۔ اسی لیے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا "کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں۔ گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب۔"

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ
وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (سورۂ آل عمران: ۱۹۰)

ترجمہ۔ بے شک آسمان اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے آنے جانے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔

تشریح اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کا ذکر فرما کر عقل مندوں کو اس جہان کے کارخانے پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ تاکہ اس غور وفکر سے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ان کے لیے آسان ہو جائے۔ قرآن غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن غور وفکر ایسا چاہیے جس سے اللہ کی معرفت نصیب ہو۔ اس کے برعکس ایسا غور وفکر جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سے دوری ہو اور انسان یہ سمجھ لے کہ اس جہاں کا کارخانہ خود

ہی چل رہا ہے۔ ایسے لوگ قرآن کی زبان میں عقلمند نہیں۔ بلکہ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی یقین کرے کہ یہ سارا مربوط و منتظم سلسلہ ضرور کسی ایک مختارِ کل اور قادرِ مطلق فرمانروا کے ہاتھ میں ہے۔ جس نے اپنی عظیم قدرت و اختیار سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حد بندی کر دی ہے۔ کسی چیز کی مجال نہیں کہ اپنے دائرۂ عمل سے باہر قدم نکال سکے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۃ

(سورۂ آل عمران : ۹۲)

ترجمہ : تم ہرگز نیکی میں کمال حاصل نہ کر سکو گے جب تک اپنی پیاری چیزیں سے خرچ نہ کرو۔

تشریح عموماً انسان مال و دولت سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس محبت کو کمزور کرنے کے لیے قرآن نے یہ رہنمائی فرمائی کہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر مال و دولت میں سے پیاری چیز اس کی راہ میں خرچ کرو۔ تاکہ ایک طرف اللہ کی محبت بڑھے اور اس کے ساتھ یہ یقین بھی پیدا ہو کہ مال و دولت، اللہ کی دی ہوئی ہے۔ اسی کی راہ میں خرچ ہونی چاہیے اور اس عمل کو نیکی شمار کیا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ عام طور پر اپنی ذاتی شہرت اور بڑائی کے لیے مال خرچ کرتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ قرآن نے جہاں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تعلیم دی ہے وہاں ذاتی اغراض کے تمام پہلو رد کر دیے ہیں۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

(سورۃ الحشر : ۷)

ترجمہ : اور جو دے تم کو رسولؐ سو لے لو اور جس سے منع کرے اسے چھوڑ دو۔

تشریح آیت کا مفہوم عام ہے۔ یعنی حضورؐ جو کام کرنے کو فرمائیں فوراً کرو۔ اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ یعنی ہر عمل اور ارشاد میں آپؐ کی تعمیل ہونی

چاہیے۔ گویا اس آیت میں صحیح اسلامی زندگی گزارنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ جو کچھ فرماتے ہیں وہ برحق ہے اور اللہ کی ہدایت سے احکام بیان فرماتے ہیں اور خود عمل کرتے ہیں۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ

(سورۃ العنکبوت : ۴۵)

ترجمہ: بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے۔

تشریح | آیت بالا کے اس ٹکڑے نے واضح کیا ہے کہ نماز میں ایسی خوبی ضرور ہے جس کے سبب نمازی بے حیائی اور برائی سے بچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کسی بیماری کی تشخیص ہو جائے اور اس کے لیے مناسب دوائی بھی تجویز ہو، تو دوا ضرور اثر دکھاتی ہے بشرطیکہ بیمار کسی ایسی چیز کا استعمال نہ کرے جو اس دوا کی تاثیر کے خلاف ہو۔ اس اعتبار سے واقعی نماز بھی قوی التاثیر ہے۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ نماز کے اندر چند ایسی خوبیاں ہیں جن کی موجودگی میں آدمی کے لیے جو واقعی نماز خلوص سے پڑھتا ہو، ممکن نہیں کہ بے حیائی اور برائی کی طرف جھکے۔

وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْھَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ
وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ (سورۃ الانعام : ۱۶۴)

ترجمہ: اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اس کے ذمّہ ہے اور بوجھ نہ اٹھائے گا ایک شخص دوسرے کا۔

تشریح | قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمّہ دار ہے۔ جو شخص جیسے عمل کرے گا، اچھے ہوں یا بُرے، اس کے مطابق جزا و سزا پائے گا۔ گویا اچھے عمل کی اچھی جزا اور برے عمل کی بری سزا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ

(سورۃ النحل : ۹۰)

ترجمہ: اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا۔

تشریح آیت کے اس حصے میں عدل و احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کے معنی انصاف کے ہیں۔ یعنی کسی کو اس کا پورا حق ادا کرنا اور احسان یہ ہے کہ کسی سے اس کے حق سے بڑھ کر مروّت اور نیکی کرنا۔ اس آیت میں جہاں لین دین کے معاملے میں انصاف کرنے کا حکم موجود ہے وہاں سب عقائد، اخلاق اور اعمال کے معاملے میں بھی انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پوری آیت میں تمام بھلائیوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اس لیے اس آیت کی جامعیت کے پیشِ نظر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے اس آیت کو خطبۂ جمعہ کے آخر میں شامل کر دیا تھا جو آج تک جمعہ کے روز خطبہ کے آخر میں پڑھا جاتا ہے۔

منتخب احادیث

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى

(بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائیؒ۔ ابن ماجہ۔ اصول کافی) (بالفاظ مختلف)

ترجمہ: بے شک اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اور بے شک انسان وہی کچھ پائے گا جو اس نے نیت کی ہوگی۔

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ (موطا امام مالک)

ترجمہ: بے شک مجھے اس لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔

(بخاری۔ مسلم)

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ میں اسے اس کے والدین اور اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔

(بخاری۔ ترمذی۔ نسائیؒ۔ ابن ماجہ۔ سنن داری۔ مسند احمد بن حنبل۔ اصول کافی بالمعنیٰ)

ترجمہ: تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ

(بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائیؒ۔ سنن دارمی۔ مسند احمد بن حنبل۔ اصول کافی)

ترجمہ: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

لَا يَرْحَمُهُ اللّٰهُ مَنْ لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ

(مسلم۔ ترمذی۔ مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔

كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ

(ابن ماجہ۔ مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ: ہر مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت۔

مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ

(مسند احمد بن حنبل۔ اصول کافی بالمعنیٰ)

ترجمہ: جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہیں ہوگا۔

مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِيْقًا مِّنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ

(بخاری۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ: جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے

راستوں میں سے کسی راستے پہ لے جاتا ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ اَخُوا الْمُؤْمِنِ کَالْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِنِ اشْتَکٰی شَیْئًا مِنْهُ وَجَدَ اَلَمَ ذٰلِكَ فِیْ سَآئِرِ جَسَدِهٖ

(مسلم۔ ترمذی۔ احمد بن حنبل۔ طبرانی)

ترجمہ: ہر مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے۔ جیسے ایک جسم۔ اگر اس جسم کا کوئی حصہ بھی تکلیف میں مبتلا ہو تو وہ اپنے سارے جسم میں تکلیف محسوس کرے گا۔

سوالات

۱۔ قرآن مجید کے اسماء کون کون سے ہیں؟ پہلی وحی کے نزول کا واقعہ تفصیل سے لکھیں۔

۲۔ مکّی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات تحریر کریں۔

۳۔ جملہ ادوار کی تفصیل بیان کریں۔

۴۔ مختصر نوٹ لکھیں:

(۱) قرآن مجید کی حفاظت (۲) قرآن مجید کی ترتیب

۵۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں:

(۱) عہد صدیقی میں قرآن مجید کی تدوین۔ (۲) قرآن مجید کا انداز بیان۔

(۳) قرآن مجید کی خوبیاں۔

۶۔ حدیث کے معنی بیان کریں۔ حدیث کی دینی حیثیت کیا ہے؟

۷۔ تدوین حدیث کے تینوں ادوار کا تفصیل ذکر کریں۔

۸۔ صحاح ستہ اور اُن کے مصنفین کے نام مع ان کے سن وفات لکھیں۔

۹۔ اصول اربعہ اور ان کے مصنفین کے نام مع ان کے سن وفات لکھیں۔

جملہ حقوق بحق سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو سندھ محفوظ ہیں

تیار کردہ : وفاقی وزارتِ تعلیم، حکومت پاکستان، اسلام آباد

نوٹیفکیشن نمبر ایف-۱۱-۱۶-۸۱ ایچ ایس ٹی، مورخہ ۲ نومبر ۱۹۸۶ء
منظور شدہ : بطورِ واحد نصابی کتاب برائے محکمہ تعلیم، صوبہ سندھ

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد   کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان   ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد
پاک سرزمین کا نظام   قوّتِ اخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت   پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد
پرچمِ ستارہ و ہلال   رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال   جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

سلسلہ وار نمبر 6173
کوڈ نمبر S.T.B 141

تاریخ اشاعت سال وماہ	تعداد	ایڈیشن	قیمت
July - 2003	15,000	First	15.00